Scanned with CamScanner

PDF By :

Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO: +92 307 2128068 : +92 308 3502081

FACEBOOK GROUP LINK :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/

Scanned with CamScanner

نیا دور کراچی

۳۱ — ۳۲

کہانی نمبر

سالانہ :- سولہ روپے

قیمت فی پرچہ :- تین روپے

شائع کردہ :- پاکستان کلچرل سوسائٹی۔ کراچی ۵

Scanned with CamScanner

ترتیب

اداریہ		۵
دلّی کی شام ~~ہماری گلی~~	احمد علی	۹
سُرخ پھول	غلام عباس	۲۳
ہاؤسنگ سوسائٹی	قرۃ العین حیدر	۴۳
حسن و عشق اور فدو میاں	ہاجرہ مسرور	۱۴۳
نغمہ کا سفر	جیلانی بانو	۱۸۳
چندن کی چِتا	جمیلہ ہاشمی	۲۲۹
شجرِ حیات	نجم فضلی	۲۷۷

تبصرے

میگھ ملہار	سلیم احمد	۳۳۰
فرہنگ اصطلاحات فلسفہ	جمیل جالبی	۳۳۵
دن اور داستان	شمیم احمد	۳۳۷

rekhta

Scanned with CamScanner

آنگن	انور عنایت اللہ	۳۳۸
بہارِ طفلی	شمیم احمد	۳۴۳
پھول	صبوحی درانی	۳۴۴
امانت	صدیق ارشد	۳۴۶
میں کیوں سوچوں	شمیم احمد	۳۵۰
سہ ماہی فنون	ثنار اللہ	۳۵۱
کاروانِ وطن	شمیم احمد	۳۵۴
دشتِ وفا	سلیم احمد	۳۵۵
ایک وائلن سمندر کے کنارے	ثنار اللہ	۳۶۴
تذکرہ علمائے ہند	انوار احمد علوی	۳۶۵

ثنار اللہ ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے باہتمام عبدالصمد عارف مطبع سعیدی قرآن محل سے چھپوا کر ۷ پیر الٰہی بخش کالونی کراچی ۵ سے شائع کیا

Scanned with CamScanner

کردار

بیگم شہناز رضا :۔ ایک تیس سالہ ٹیڈی ٹائپ خاتون

رضا صاحب :۔ صاحب قسم کے خوش شکل اور خوش وضع آدمی

ضیائی صاحب :۔ موٹے لمبے بال بالکل سفید۔ چمڑے کی جیکٹ اور تنگ پتلون میں ملبوس

چیری :۔ آٹھ دس سالہ بیگم شہناز اور رضا کا بیٹا۔ کاؤ بوائے لباس میں ملبوس۔

فدا :۔ بوڑھا ملازم۔ حرکات و سکنات میں مسخرا پن

دو مزدور :۔ جیسے ہونا چاہئیں۔

وقت :۔ سہ پہر۔

Scanned with CamScanner

(ایک کشادہ کمرہ، جس میں صوفہ سیٹ، دیوان، تپائیاں، سیٹی، اور ایک بک سیلف ہے جو کتابوں سے بالکل خالی ہے اس پر صرف بیگم رضا کی ایک خوبصورت تصویر رکھی ہوئی ہے۔ دیواریں آرائش سے خالی ہیں۔ زمین پر قالین ہے اور دروازوں پر پردے۔ ایک دروازہ جو خاصا چوڑا ہے عقبی دیوار میں کھلتا ہے دوسرا بائیں ہاتھ کی دیوار میں کھڑکی دائیں ہاتھ کی دیوار میں ہے۔

پردہ اٹھنے پر بیگم دیوان میں بیٹھی نیٹنگ کرتی نظر آتی ہے۔ چپڑی صوفے پر بیٹھا کومک پڑھ رہا ہے۔ فدا عقبی دروازے سے چائے کی ٹرالی ڈھکیلتا کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ کندھے پر پڑا ہوا نیپکن عادتاً اٹھا کر دوسرے کندھے پر ڈالتا ہے اور بڑے تکلف سے کھنکارتا ہے۔)

فدا:۔ حضور بیٹا بیگم چائے حاضر ہے۔

بیگم:۔ ہوں — اچھا۔ (بُنتی رہتی ہے)

فدا:۔ (رازداری سے) حضور ذرا جلدی پی لیجئے۔

بیگم:۔ (جھنجھلا کر) افوہ! سر پر سوار ہو جاتے ہو ہر وقت۔ پی لیں گے۔ کون سی گاڑی چھٹی جا رہی ہے۔

فدا:۔ (گردن سہلا کر) گاڑی؟ (نیپکن دوسرے کندھے پر رکھ کر سرگوشی میں) گاڑی تو نہیں حضور، ہاں ٹرک چھٹ جائے گا ملک صاحب کا۔

بیگم:۔ (کچھ گھبرا کر) اوہ — اچھا تو ٹرک آج ہی بھیجنا تھا ملک نے۔ (کچھ غصے سے) بے صبرے کہیں کے۔

فدا:۔ یہ بات تو ہے حضور۔

بیگم:۔ کہا تھا کہ ہمارے جانے کے بعد آئیں۔ چیزیں کہیں بھاگ تو نہیں جاتیں۔ ایسے ہولا گئے جیسے کبھی کاہے کو کچھ دیکھا ہو۔ کمبخت نو دولتے کہیں کے۔ ذرا مروت نہیں۔

فدا :۔ یہ بات تو ہے حضور۔ ملک صاحب پہلے لوہار کی دوکان پر لوہا کوٹتے تھے۔ پاکستان بنا تو انھوں نے کہیں سے لوہے کا کوٹہ ہتھیا لیا۔ اب تو فیکٹری والے ہو گئے (رک کر بے تکلفی سے) اجی آپ کی تو دوستی ہے ان لوگوں سے۔ آپ کو کیا بتانا۔ رتی رتی حال معلوم ہوگا ان کا۔

بیگم :۔ (اپنائیت سے) کیسی باتیں کرتے ہو فدو بابا۔ لعنت بھیجو دوستی پر۔ کبھی وہ میاں بیوی ہمارے ہاں آ گئے کبھی ہم اُن کے ہاں چلے گئے۔ مہینے میں ایک آدھ بار اکٹھا پکنک کو چلے گئے یا ہفتے میں دو ایک دفعہ سینما دیکھ لیا تو دوستی ہو گئی؟ ـــ ہنہ ! پاگل پن کی باتیں کرتے ہو ـــ

فدا :۔ (نیپکن کی نشست بدل کر) یہی تو میں کہہ رہا ہوں حضور بیٹا بیگم ـــ کبھی انہوں نے آپ کے ہاں کھانا کھا لیا، کبھی آپ نے ان کے ہاں۔ کبھی انہوں نے آپ کے ہاں کچھ بھیج دیا، کبھی آپ نے انہیں کوئی چیز بھیج دی تو اس سے کوئی دوستی ہو گئی ـــ اب دیکھئے حضور آپ نے ایک دن ان کے ہاں گاجر کا حلوا بنوا کر بھیجا تھا۔

بیگم :۔ (جل کر) تو اس سے کیا ہوتا ہے یہی تو میں کہہ رہی ہوں ـــ (کچھ سوچ کر) مگر مجھے تو یاد نہیں کہ کبھی میں نے گاجر کا حلوہ بھیجا تھا ان کو؟

فدا :۔ اجی انہی دنوں حضور جب آپ گرمیوں میں ٹھیٹر ٹھیٹر کھیلنے کو بے چین تھیں۔

بیگم :۔ (چونک کر) ہاں آں ـــ اچھا۔ (ہنس کر) جب میں وہ ڈرامہ "گڑیا کا گھر" تیار کر رہی تھی۔ خیر تم یہ ڈرامے کا کیا ذکر لے بیٹھے۔

فدا :۔ (نیپکن کی نشست بدل کر) حضور ہمارے زمانے میں بڑے شاندار ٹھیٹر ہوتے تھے۔ ماسٹر اللہ دیا لیلیٰ بنتا تو بس حجاب تڑپا دیتا۔

بیگم :۔ (غصے سے) اوہ ـــ پاگل کہاں کی بات کہاں ملاتے ہو۔ میرے ڈراموں میں لیلیٰ مجنوں کا کیا ذکر ـــ وہ تو بالکل بے ہودہ بازاری پن ہوتا تھا ـــ ارے فدو میاں یہ دیا تھیٹر نہیں ہوتا۔

فدا :۔ (مایوسی سے) تو حضور ہمیں کیا۔ لیلیٰ ہو کہ گڑیا ہو ـــ ہم نے تو اب سب باتوں سے توبہ

کرلی۔ اللہ کے گھر جانا ہے ــــ

بیگم :۔ (جھنجھلا کر) ارے تو یہ ڈرامہ کوئی گناہ ہوتا ہے دھت ہے بھئی۔ ارے دیوانے آج کل ڈرامہ کھیلنا تو بڑی عزت کی چیز ہے ــــ لوگوں میں، سرکار دربار میں ہر جگہ عزت ہوتی ہے میری ــــ ورنہ تمہارے رضا صاحب مجھے کوئی ایسی ویسی بات کرنے دیتے جو عزت کی نہ ہوتی ــــ معلوم ہوتا ہے کہ تم پاپا کی باتیں سنتے ہو ــــ پاپا تو نئے زمانے کی ہر بات کو برا سمجھتے ہیں ــــ

فدا :۔ (مایوسی سے سر جھکا کر) جی یہ بات تو ہے ــــ (نیکپن کی نشست بدل کر) میں تو ذکر کر رہا تھا بیگم ملک کا۔ آپ نے گاجر کا حلوہ بھیجا تھا ان کو۔

بیگم :۔ بھیجا تھا۔ تو پھر کیا ہوا۔

فدا :۔ ہوا کیا۔ حلوہ لے کر بولیں (زنانہ آواز میں) ارے ہمارے ملک صاحب نے بیگم رضا کے پیچھے ہزاروں روپیہ اٹھایا اور انہوں نے حلوہ بھیجا ہے نزاکت سے اتنا سا ــــ

بیگم :۔ (غصے سے کھڑے ہو کر) کیا ــــ؟ یہ کہا تھا انہوں نے؟ (ہونٹ کاٹتی دروازے کی طرف جاتی ہے)

فدا :۔ (بھاگ کر دروازہ روکتے ہوئے) ارے ارے حضور غصے میں کچھ کر نہ بیٹھیے گا۔ پھر عین وقت پر سامان کی مشکل ہو جائے گی حضور۔

(چیری سر اٹھا کر دونوں کو بے حد متفکرانہ نظروں سے دیکھتا ہے اور لمبی ٹھنڈی سانس لے کر دوبارہ کونک پر جھک جاتا ہے)

بیگم :۔ (جھلا کر) میں کیا کر رہی ہوں بے وقوف ــــ (کمرے کے وسط میں آجاتی ہے) فدو بابا تم نے یہ گاجر کے حلوے والی بات مجھے پہلے بتائی ہوتی تو میں اپنا سامان ان بیگم صاحبہ کے ذریعہ ہرگز نہ دیتی۔

فدا :۔ (سوچ کر) بتایا تو تھا شاید۔

بیگم :۔ (اونچی آواز میں) خاک بتایا تھا۔ باتیں بنانا کوئی تم سے سیکھے ــــ اچھا خیر اب تم پاپا کے گھر جا کر نہ کہہ دینا یہ باتیں۔ بہت منہ چڑھے ہو تم ان کے ــــ خواہ مخواہ پاپا بات

سمجھیں گے نہیں اور شور مچائیں گے۔

فدا:۔ یہ بات تو ہے (نیکین کی نشست بدلتا ہے)

بیگم:۔ خیر میں سمجھوں گی بیگم ملک سے۔ کبھی نہ کبھی تو موقع لگے گا۔ کمبخت لوہار! ڈرامے پر اسکے میاں نے کچھ خرچ کر دیا تو سمجھتی ہے کہ میری ذات پر احسان کر دیا۔ جاہل عورت آرٹ کی قدر کیا جانے۔ اس کا میاں بے چارہ ذرا سمجھ دار ہے اور آرٹ کی سرپرستی کرنا چاہتا ہے اس لئے میں نے اسکو اپنے "ڈرامہ سرکل" کا پریذیڈنٹ بنا دیا۔ یہ احسان کچھ کم تھا کہ رضا صاحب نے کہہ سنکرا سے نئی موٹر کا پرمٹ بھی دلا دیا ـــــ کمبخت احسان فراموش کہیں کی۔

فدا:۔ جی یہ بات تو ہے (گردن کھجا کر) حضور بیٹا بیگم ایک بات پوچھوں۔

بیگم:۔ (دیوان پر بیٹھتے ہوئے) کیا؟

فدا:۔ یہ "پلے زی ڈنٹ" کیا ہوتا ہے؟

بیگم:۔ (اون اور سلائیاں اٹھا کر) اچھا اب کان نہ کھاؤ میرے۔ جا کر وہ سامان اکٹھا کر لو جو پاپا کے گھر چھوڑ جانا ہے۔

فدا:۔ بہت اچھا حضور آپ کو فرصت نہیں (چیری کے قریب جا کر) چیری میاں! آپ کو کیا پتہ ہوگا کہ "پلے زی ڈنٹ" کیا ہوتا ہے۔ بے چارے اتنے سے تو ہیں ابھی۔

چیری:۔ (بجد متکلمانہ انداز سے) فدو بابا کتنی دفعہ کہا ہے کہ میرے سامنے غلط انگریزی نہ بولا کرو۔

فدا:۔ (گردن کھجا کر) اچھا تو "پلے زی ڈنٹ" انگریزی ہوتا ہے لیکن یہ ہوتا کیا ہے چیری میاں۔

چیری:۔ (بے حد بے تعلقی سے) ہمارے اسکول میں "پرے زی ڈنٹ" وہ ہوتا ہے جو کرسی پر چپکا بیٹھا رہتا ہے اور سب خوب بولتے ہیں۔

فدا:۔ (سر ہلا کر) ہوں تو آپ ابھی "پلے زی ڈنٹ" بنے بیٹھے تھے۔

بیگم:۔ (بُنتے ہوئے) ارے فدو بابا کتنی دیر سے کہہ رہی ہوں کہ جاؤ کام کرو۔ لیکن میری بات

Scanned with CamScanner

سننے کی تمہیں فرصت بھی ہو۔

(فدا غصے سے کندھے پر نیپکین کی نشست بدلتا ہے اور دروازے کی طرف جاتا ہے۔ ایک لمحے بعد پھر کمرے میں جھانکتا ہے)

فدا:۔ (رازدارانہ طریقے سے) حضور وہ موٹر کی بات پکی ہو گئی کہ نہیں۔

بیگم:۔ ارے جاؤ بس تم اپنا کام دیکھو۔ ہمارے کام ہم پر چھوڑ دو۔ آگئے بے چارے اب اتنی بڑی موٹر کی فکر سر پر لاد دینگے۔

(فدا سخت بُرا منہ بنا کر چلا جاتا ہے۔ بیگم ٹرالی کھینچ کر اپنے قریب کرتی ہیں اور چائے پیالیوں میں ڈالتی ہیں)

بیگم:۔ (جیسے جیری سے مخاطب ہوں) دیکھو تو ذرا یہ کمبخت پرانے نوکر بھی جان کے لاگو ہوتے ہیں ہر وقت ان کے سامنے حجاب دبی ہوئی رہتی ہے۔

جیری:۔ (لمبی سانس لے کر بغیر نظر اٹھائے) پور (POOR) ممی۔

(بیگم چونک کر جیری کو دیکھتی ہے اور پھر چائے کی پیالی میں شکر گھولنے لگتی ہے اسی وقت رضا صاحب ٹائی کی گرہ درست کرتے عقبی دروازے پر نمودار ہوتے ہیں)

رضا صاحب:۔ ہیلو ڈارلنگ۔

بیگم:۔ (ایک دم خوش ہو کر دیوان سے اٹھتے ہوئے) ارے آپ تیار بھی ہو گئے ــــ "ہاؤ اسمارٹ"

رضا:۔ (مسکرا کر) اور تم تو ہر وقت ہی تیار رہتی ہو ــــ اس رنگ میں تم بہت کھلتی ہو۔ اور یہ بالوں کا انداز ــــ

بیگم:۔ (شرما کر) ہٹئے۔ میں نے آپ کی تعریف کر دی اس لئے بدلے میں میری تعریف ہو رہی ہے۔

جیری:۔ (کومک پڑھتے ہوئے) اور ڈیڈی میرے بارے میں کیا خیال ہے؟

رضا:۔ (زور سے ہنس کر) ممی کے سو نمبروں میں سے پچاس تمہارے۔

جیری:۔ تھینک یو ڈیڈی (پھر پڑھنے لگتا ہے)

Scanned with CamScanner

بیگم :۔ آیئے ایک پیالی چائے تو پی لیجئے۔

رضا :۔ ارے ڈارلنگ قریشی صاحب کے ہاں چائے پینے ہی تو جا رہے ہیں۔

بیگم :۔ (پیارا سا منہ بنا کر) قائل ہو گئے بھی مت پیجئے ہماری بے چاری چائے۔ (رک کر) اچھا دیکھئے قریشی صاحب سے معذرت کر لیجئے گا میرے نہ پہنچنے کی۔

رضا :۔ اچھا۔ ٹاٹا چیری۔ ٹاٹا ڈارلنگ (رضا جانے کو چند قدم اٹھاتا ہے)

بیگم :۔ ارے۔ ارے سنو تو ڈارلنگ (رضا رک جاتا ہے)

بیگم :۔ قریشی صاحب سے ڈرامہ سرکل کی بات ضرور کیجئے گا۔ آخر ان کا ڈپٹی سکریٹری ہونا کس دن کام آئے گا۔ وہ کوشش کریں تو ہمارے ڈرامہ سرکل کو سرکاری مدد ضرور مل جائے گی ـــــ (دیوان پر بیٹھ کر) کیا بتاؤں رضا ڈارلنگ مجھے ڈرامہ سرکل چھوڑتے ہوئے کتنا دکھ ہو رہا ہے۔

رضا :۔ (لاپروائی سے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیر کر) خواہ مخواہ۔ ارے دو سال بعد تو ہم امریکہ سے واپس آجائیں گے۔ پھر وہی ڈرامہ سرکل ہو گا اور تم ہو گی۔

بیگم :۔ کون جانے اس وقت تک ڈرامہ سرکل ختم ہی نہ ہو گیا ہو۔ سارا گروپ میں نے بنایا تھا۔ پھر تم جانتے ہو ڈارلنگ مس رحمان کو میں اس گروپ میں لانے کو لے آئی مگر پچھتاتی ہوں۔ اب وہ ڈرامہ سرکل کا بھٹہ بٹھائیں گی ـــــ میں ہوتی تو سب سنبھال لیتی۔

رضا :۔ تو پھر تم بھی چلی چلتیں قریشی صاحب کی پارٹی میں۔ ان سے سرکاری مدد کی بات بھی کر لیتیں اور یہ بھی لکھوا لیتیں کہ مس رحمان پر بھروسہ نہ کیا جائے۔

بیگم :۔ (ادا سے) ہائے اللہ آپ کو ہر وقت مذاق سوجھتا ہے۔ اب میں کوئی مس رحمان سے جلتی ہوں جو ایسی باتیں کر رہے ہیں (منہ بسورتی ہے)

رضا :۔ تو پھر چل رہی ہو ـــــ مجھے دیر ہو رہی ہے ـــــ ٹیکسی بھی پکڑنا ہے۔

بیگم :۔ کیسے نکلوں گھر سے، میری قسمت میں تو قید لکھی ہے آج کل۔ اب اس لوہار نے ٹرک بھجوا دیا ہے ابھی سے۔

رضا :۔ (حیرت سے) لوہار؟ کون! (ایک دم قہقہہ لگا کر) اچھا سمجھ گیا۔ یہ بیگم ملک کو نیا

خطاب ملا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کچھ ناراض ہو گئی ہو ـــــ ٹرک آگیا ہے تو فدو بابا سامان لدوا دے گا۔ تم چلی چلو میرے ساتھ۔

بیگم :۔ اور ابھی ضیائی صاحب بھی تو آئیں گے۔ (رضا کے قریب جا کر) کیا خیال ہے پھر ہاں کر دوں اُن سے بارہ ہزار میں مانگ رہے تھے۔ میں نے تیرہ ہزار کہے تھے۔

رضا :۔ ارے میں تو سمجھا تھا کہ فیصلہ ہو چکا۔ تم ابھی نک پیسے بڑھوانے کی فکر میں ہو۔ (رک کر) دیکھو ڈارلنگ میرے خیال میں قیمت پر ضد نہ کرنا۔ بارہ ہزار کہتے ہیں بارہ ہزار پر ہی مان جاؤ۔ ضیائی صاحب کا حق بھی ہم پر کچھ زیادہ ہی ہے۔ بے چارے ضیائی صاحب نے ہمیشہ اپنے اخبار میں تمہاری پیش کئے ہوئے ڈراموں کی بے تحاشہ تعریف کی ہے۔ میرے خیال میں موٹر چلانے اور تعریف کرنے کے لئے برابر کے سلیقے کی ضرورت ہوتی ہے

بیگم :۔ (اتراکر) ہٹئے ـــ واہ یوں کہہ رہے ہیں آپ تو جیسے میرا ڈرامہ سرکل تو بوگس ہے بس ضیائی صاحب کو تعریف کرنے کا سلیقہ ہے۔ مجھے تو کچھ آتا جانا نہیں۔

چیری :۔ (کاک پر جھکے جھکے) ڈیڈی آپ کو خبر نہیں۔ جب ممی ڈرامہ یاد کرتی ہیں تو میں انہیں بتاتا ہوں کہ یوں کیجئے یوں نہ کیجئے ـــ پوچھ لیجئے ان سے ـــ

رضا۔ (زور سے ہنس کر) لو۔ تمہیں "بلڈ اپ" کرنیکا ایک اور دعویدار یہیں موجود ہے۔

(بیگم مسکراہٹ دبانے کی کوشش کرتی ہے)

چیری :۔ اچھا ڈیڈی آپ میری بات نہیں مانتے۔

رضا :۔ اپنی ممی سے منواؤ بیٹے ـــ اچھا بھئی اب چلے ـــ (جاتا ہے)

بیگم :۔ (دروازے تک جاتے ہوئے) جلدی آیئے گا اور دیکھئے سرکاری امداد کی بات کرنا نہ بھولئے گا قریشی صاحب سے۔

(بیگم واپس آکر ٹرالی میں سے چائے کی پیالی اٹھا لیتی ہے اور ایک گھونٹ پیتی ہے چیری کوک گھٹنوں پر رکھ کر اس پر اپنی کہنیاں جماتا ہے اور پھر اپنی ہتھیلیوں پر اپنا چہرہ رکھ کر بڑی سنجیدگی سے بیگم کی طرف دیکھتا ہے)

Scanned with CamScanner

بیگم :۔ (چیری کی طرف دیکھ کر) کیا دیکھ رہے ہو چیری۔ پڑھتے کیوں نہیں۔
چیری :۔ ممی میں سوچ رہا ہوں کہ ضیائی انکل آپ کی تعریف کیوں کرتے ہیں۔
بیگم :۔ (گھبرا کر) تعریف نہیں اسے "تنقید" کہتے ہیں بیٹے۔
چیری :۔ تنقید کیا ہوتی ہے ممی؟
بیگم :۔ (بے دھیانی سے) تنقید؟ تنقید ہوتی ہے بھئی۔
چیری :۔ لیکن کیا ہوتی ہے ممی۔
بیگم :۔ (جھلا کر) انگریزی اسکول میں ستیاناس ہو گیا تمہارا۔ تنقید کو انگریزی میں "کری ٹی سیزم" کہتے ہیں بھئی۔
چیری :۔ "کری ٹی سیزم" کیا ہوتا ہے؟
بیگم :۔ (جھلا کر) اب میں کہاں تک تمہیں ہر بڑے لفظ کے مطلب بتاؤں۔ جب بڑے ہو جاؤ گے تو اس کا مطلب معلوم ہو جائے گا۔
چیری :۔ ممی بڑے آدمی بڑے لفظ کیوں بولتے ہیں۔
بیگم :۔ اچھا اب چپ بھی رہو۔ مجھے کچھ سوچنے کا موقعہ بھی دیا کرو۔
چیری :۔ اچھا ہمیں نہیں بتائیں ـــ ہم جانتے ہیں کہ ضیائی انکل آپ پر کیا کرتے ہیں؟ (پراسرار انداز سے مسکراتا ہے)
بیگم :۔ (غصے سے) کیا جانتے ہو، کیا کرتے ہیں ضیائی انکل۔
چیری :۔ وہ "کری ٹی سیزم" کرتے ہیں۔" نانا ابا کو بتاؤں گا کہ ضیائی انکل کیا کرتے ہیں۔ ممی پر۔
بیگم :۔ لو اب اور بے وقوفی کی باتیں شروع کر دیں۔ تمہارے نانا ابا کو ڈرامے پسند نہیں خبردار جو اُن سے کوئی بات کی۔
چیری :۔ نانا ابا کو ڈرامہ کیوں پسند نہیں؟
بیگم :۔ اچھا اب دماغ نہ کھاؤ میرا تمہارے سوالوں سے تو میں تنگ آ گئی ہوں۔ آج کل کے بچے ہیں یا ارسطو افلاطون؟ لو چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

Scanned with CamScanner

(پیالی اٹھا کر چیری کی طرف بڑھاتی ہے۔ چیری بڑی گھمبیر چال سے ماں کے قریب آتا ہے اور پیالی تھام لیتا ہے)

چیری:۔ ممی ارسطو افلاطون کیا ہوتا ہے؟

بیگم:۔ تمہارا سر۔ کسی وقت کچھ سوچنے کی مہلت بھی دیا کرو۔

(دودھ دان اٹھا کر چیری کی پیالی میں اور دودھ ڈال دیتی ہے)

چیری:۔ (پیالی بیگم کی طرف بڑھا کر) پلیز ممی۔

بیگم:۔ (پیالی پکڑ کر) کیوں کیا بات ہے؟

چیری:۔ یہ دودھ والی چائے آپ پیجئے میں "اسٹرونگ ٹی" پسند کرتا ہوں۔

بیگم:۔ (سخت غصے سے) اوہ۔ ہر وقت دادا ابا بنے جاتے ہو۔ دفع ہو نہیں ملے گی چائے۔

(چیری پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا رہتا ہے۔ بیگم اپنی پیالی میں اور چائے بنا کر پینے لگتی ہے۔ چند لمحوں کے وقفے کے بعد باہر سے موٹر کے رکنے کی آواز آتی ہے۔ بیگم ایک دم پیالی ٹرالی میں رکھ کر کھڑی ہو جاتی ہے لیکن پھر بیٹھ جاتی ہے اور قدموں کی چاپ سنکر چہرہ پرسکون بنا کر سوئٹر اور سلائیاں اٹھا کر بڑی محویت سے بننے لگتی ہے)

چیری:۔ (وہیں کھڑے کھڑے) ممی آپ کا (FACE) فیس اس طرح ٹھیک نہیں لگ رہا ہے۔

(بیگم چونک کر چیری کو سخت نظروں سے دیکھتی ہے اور دیوان پر انداز نشست بدل کر اپنے چہرہ کا زاویہ بدل دیتی ہے۔ ضیائی بائیں ہاتھ کی دیوار میں کھلنے والے دروازے پر نمودار ہوتا ہے اور بیگم کی طرف غور سے دیکھتا ہے۔

ضیائی:۔ (دروازے پر رک کر) افوہ! بڑی محویت سے بنائی ہو رہی ہے۔ آپ کا یہ روپ بھی خوب ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ڈرامہ سرکل کی بیگم شہناز رضا 'سوئی سلائی' میں بھی یوں محو ہو سکتی ہیں۔

بیگم:۔ (سینے پر دوپٹہ ٹھیک کر کے) ارے۔ آپ آگئے ضیائی صاحب۔ بیٹھئے آکر۔ یا

وہیں سے قصیدہ کہتے رہیں گے۔ تشریف لائیے نا ــــ (ہنستی رہتی ہے)

ضیائی:۔ (مسکراکر) دربار وں میں کھڑے ہو کر ہی قصیدہ پڑھا جاتا تھا۔ (چیری کی طرف دیکھ کر) ہیلو چیری یوں کھڑے ہو کر ممی سے سوئیٹر بنواتے ہو بھئی۔

(چیری کے پاس آکر اسکے سر پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ چیری کوئی جواب نہیں دیتا۔ منہ پھلائے کھڑا رہتا ہے)

بیگم:۔ (جھینپ کر) ارے یہ چیری کے لئے نہیں بُن رہی ہوں۔ یہ تو رضا صاحب کے لئے ہے۔ امریکہ میں تو ان دنوں کڑاکے کی سردی ہو گی۔ میں نے سوچا یہ ڈبل نٹنگ اون کا ایک سوئیٹر بھی جلدی سے بنالوں۔ (مسکراکر) رضا صاحب پر یہ رنگ خوب کھلے گا نا؟

ضیائی:۔ (لمبی سانس لے کر) بہت کھلے گا (ایک اور سانس لے کر) کبھی کسی نے ہمارا سوئٹر نہ بنا (جیب سے موٹا سا سگار نکالتا ہے اور بڑے افسوس سے اسے ماچس پر ٹھونکتا ہے)

بیگم:۔ واقعی؟ کیسی بری بات ہے (چہرے پر سوگ طاری کرکے) ماشاء اللہ چار چار جوان بیٹیاں آپ کی اور ایک عدد بیوی الگ۔ کسی کو اتنا ہوش نہیں کہ ایک سوئٹر ہی بن دیں۔

ضیائی۔ (جلدی سے گھبراکر پلٹتے ہوئے) رہنے دیجئے۔ یہ ذکر نہ کیجئے۔ میں نے کونسی محبت دی ان سب کو۔ (صوفے پر جیسے ٹوٹ کر گر جاتا ہے)

بیگم:۔ ہائیں ــــ (آنکھیں پھاڑ کر) آپ ان سے۔ یعنی اپنی بیوی اور بیٹیوں سے محبت نہیں کرتے! (شرماکر) رضا صاحب تو ــــ

ضیائی:۔ (لمبی سانس لے کر) آپ سے محبت کرتے ہیں کیونکہ آپ محبت کرنے کی چیز ہیں۔

بیگم:۔ توبہ کم سے کم آپ کی بیٹیوں کو تو اتنا خیال چاہئے کہ ایک سوئیٹر بن دیں میں تو ہر سال چھ سات سوئٹر بنتی ہوں رضا صاحب کے لئے ــــ

ضیائی:۔ چھوڑیئے اس قصے کو ــــ میں تو "تھری پیس سوٹ" پہن کر ہی خوش ہو لیتا ہوں اسی لئے ــــ (سگار سلگاتا ہے)

بیگم :۔ (رنجیدہ ہو کر) چہ چہ۔ میں یہاں ہوتی تو اس موسم میں ایک سوئیٹر آپ کے لئے ضرور بن دیتی۔

ضیائی :۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر پر اسرار آواز میں) تو آپ سچ مچ یہاں نہیں بھی ہوں گی ؟

بیگم :۔ (گھبرا کر کھڑے ہو کر ٹرالی پیچھے ڈھکیلتے ہوئے) ارے یہ بھی کوئی جھوٹ ہے کہ رضا صاحب کو گورنمنٹ دو سال کے لئے امریکہ بھیج رہی ہے۔ کتنی دفعہ آپ کو بتایا کہ ٹکٹ لئے جا چکے ہیں دس تاریخ کے۔ اور کل دس ہے جناب (چیری سے مخاطب ہو کر) تم کیا کھمبے کی طرح جمے کھڑے ہو ؟

چیری :۔ (منہ پھلائے پھلائے ضیائی کی طرف آ کر کوک ان کے نیچے سے گھسیٹتے ہوئے) پلیز انکل کشن رکھ لیجئے۔

ضیائی :۔ (جھینپ کر) اوہ ـــ چیری معاف کرنا بھئی۔

چیری :۔ (بزرگانہ انداز سے) کوئی بات نہیں انکل ـــ مگر انکل ضیائی آپ ممی کی بات کا یقین کیوں نہیں کرتے کہ کل ہم فلائی (FLY) کر رہے ہیں۔ پور (POOR) ممی کوئی ہر وقت ڈرامہ تھوڑی کرتی ہیں۔ آپ یقین کیجئے نا۔ (کاک کھول کر صوفے کے دوسرے سرے پر بیٹھنے لگتا ہے)

بیگم :۔ (سختی سے) چیری، باہر جا کر کھیلو۔ بڑوں کی باتوں میں نہیں بولا کرتے۔ کتنی بار سمجھایا ہے تمہیں۔

(چیری کاک لئے منہ پھلائے بائیں ہاتھ کے دروازے سے غائب ہو جاتا ہے۔ بیگم چیری والی چائے کی پیالی دیکھتی ہے اور اسے اٹھا کر دروازے کی طرف جاتی ہے)

بیگم :۔ چیری۔ اے چیری اپنی چائے لے جاؤ۔

(ایک لمحے انتظار کے بعد جب چیری کو کمرے میں آتا نہیں دیکھتی تو پیالی ٹرالی میں رکھ کر سوئٹر اور سلائیاں اٹھا کر کھڑے کھڑے بننا شروع کر دیتی ہے)

Scanned with CamScanner

ضیائی :۔ (سگار کا ایک کش لے کر) چائے تو ہم نے بھی نہیں پی آج شام۔ سوچا تھا کہ آپ کے ہاں کی چائے پئیں گے مگر آپ نے تو پوچھا بھی نہیں۔

بیگم :۔ (اون اور سلائیاں دیوان پر ڈال کر) اے۔ میں تو آپ کی موجودگی میں سبھی کچھ بھول جاتی ہوں (ٹرالی پر جھک کر پیالی میں چائے ڈالنے لگتی ہے)

ضیائی :۔ (صوفے سے اٹھ کر بیگم کے قریب آتے ہوئے) سچ! آپ میری موجودگی کو اتنی اہمیت دیتی ہیں۔

بیگم :۔ (غیر جذباتی لہجے میں) مرعوب جو ہو جاتی ہوں۔

(ضیائی اپنا ہاتھ جھکی ہوئی بیگم کے کندھے پر رکھنا چاہتا ہے لیکن جھجکتا ہے اور پھر ہاتھ کو کوٹ کے کالر سے پونچھ کر دھیرے دھیرے کندھے کی طرف بڑھاتا ہے۔ اسی وقت چیری اندر آ کر ضیائی کے برابر کھڑا ہو جاتا ہے اور ناقدانہ انداز سے ضیائی کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کے ساتھ اپنی گردن آگے بڑھاتا ہے۔ ضیائی چیری کو قریب دیکھ کر ایک دم اپنا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈال لیتا ہے اور ماچس کی ڈبیا نکال کر گھبراہٹ میں چیری کی طرف بڑھا دیتا ہے)

چیری :۔ (ماچس لے کر) تھینک یو انکل ــــ میں نے ابھی سگار پینا شروع نہیں کیا۔

بیگم :۔ (جیسے کچھ خبر نہیں) تم پھر آ گئے چیری۔ تمہیں میں نے سزا دی تھی۔

چیری :۔ سوری ممی۔ میں تو یہ کہنے آیا تھا کہ یہ "اسٹرونگ ٹی" مجھے پسند ہے ڈیڈی کی طرح ــــ میں وہ چائے ملا دودھ ہرگز نہیں پیوں گا (پیالی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے)

بیگم :۔ (پیالی الگ ہٹا کر) یہ ضیائی صاحب کے لئے ہے ــــ ہٹو، پینا ہے تو اپنی پیالی لے جاؤ ــــ (چیری انکار میں سر ہلاتا ہے) تو پھر کمرے سے جاؤ تمہاری یہی سزا ہے۔

(چیری بائیں ہاتھ کے دروازے سے چلا جاتا ہے بیگم چائے کی پیالی ضیائی کی طرف بڑھاتی ہے۔ ضیائی پیالی سے ایک چسکارے والا گھونٹ بھر کر چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتا بک شیلف تک آتا ہے جس پر

Scanned with CamScanner

بیگم کی تصویر رکھی ہوئی ہے ـــــ بیگم ٹانگ اٹھا کر دیوان پر بیٹھ جاتی ہے۔ اور ضیائی کی طرف دیکھتی ہے جو اسکی فریم کی ہوئی تصویر ہاتھ میں اٹھائے، سے غور سے دیکھ رہا ہے)

بیگم:۔ کیا دیکھ رہے ہیں آپ ـــ چائے پیجئے بالکل ٹھنڈی ہو جائے گی۔

ضیائی:۔ (تصویر کو والہانہ انداز سے دیکھتے ہوئے) ان نازک ہاتھوں سے بنی ہوئی چائے اتنی جلدی ختم کرتے ہوئے دکھ ہوگا۔ یہ چائے تو آہستہ آہستہ گھونٹ گھونٹ پی جانی چاہئے جیسے کوئی امرت رس پیئے۔ جیسے کوئی نازک لبوں کا ـــــ

بیگم:۔ (گھبرا کر کھڑی ہوتی ہے) آئیں ـــ آج آپ ـــ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔

(آنکھیں بڑی ادا سے پھاڑ کر اور منہ کھول کر تصویر حیرت بن جاتی ہے)

ضیائی:۔ (پیالی بک شیلف پر رکھ کر جلدی سے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے) بس بس یونہی رہئے۔ چہرہ اسی طرح رہنے دیجئے ـــ (بڑی گیلی سی آواز میں) بالکل تصویر سے بہتر لگ رہی ہیں آپ۔

بیگم:۔ (منہ اسی طرح اٹھائے اٹھائے) ہائے اللہ؟

ضیائی:۔ (لمبی سانس لے کر) اس "ہائے اللہ" سے تصویر اور مکمل ہو جاتی ہے۔ تصویر حیرت!!

بیگم:۔ (خاموش ہو کر) آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں ضیائی صاحب؟ (دیوان پر سے اٹھ کر ضیائی کے قریب آتی ہے اور تصویر اسکے ہاتھ سے لے کر) آخر آج میرا اور میری تصویر کا دنگل کیوں کرائے دیتے ہیں آپ؟

ضیائی:۔ (منہ پھیر کر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے) موازنہ آپ کا اور تصویر کا نہیں ـــ میں تو آپکی بے خبری اور تصویر کی بے خبری کا مقابلہ کر رہا تھا۔ دونوں کو ہمارا حال نہیں معلوم (دو قدم اور دور جا کر) کسی کو ہمارا حال نہیں معلوم۔

بیگم:۔ (اپنی تصویر غور سے دیکھتے ہوئے) آج آپ مذاق کے موڈ میں ہیں ضیائی صاحب۔

ضیائی:۔ (اسی طرح پیٹھ پھیرے ہوئے) جی ہاں آپ کے لئے مذاق ہے۔

بیگم:۔ (سنجیدہ ہو کر) آج تک آپ نے ایسی عجیب باتیں نہیں کی تھیں مجھ سے۔

Scanned with CamScanner

ضیائی :۔ (اسی طرح تیز آواز میں) اور آپ آج تک کبھی ہمیں چھوڑ کر اتنی دور بھی نہیں جا رہی تھیں۔

بیگم :۔ (ہونٹ سکیڑ کر آنکھیں نچاتے ہوئے) اوہ ـــ میں سمجھی! آپ کو ہمارے جانے کا رنج ہو رہا ہے (ہنستی ہے)

ضیائی :۔ (منہ دوسری طرف کئے کئے) جی ہاں۔

بیگم :۔ (سنجیدہ ہو کر اپنی قمیض کولھوں پر ٹھیک کرتے ہوئے) دراصل میں اور رضا بھی آپ کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ رنج تو ہمیں بھی ہے۔

ضیائی :۔ (بات کاٹ کر) کاش آپ میری عزت نہ کرتیں۔ عزت تو سراسر غیریت کی خلیج بن جاتی ہے۔

بیگم :۔ (جیسے بُرا مان رہی ہو) واہ آپ اپنے کو اتنا حقیر کیوں سمجھتے ہیں۔ اتنے قابل انسان کی عزت نہ کی جائے تو کیا بے عزتی کی جائے۔ اور پھر آپ تو میرے پاپا کے اتنے پرانے دوست ہیں۔

ضیائی :۔ (ایک دم مڑ کر بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے) صرف آپ کے پاپا کا دوست۔ بس۔

بیگم :۔ اے لیجئے پاپا کے دوست ہیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ ہمارے دشمن! واہ بھئی واہ جو بات کہتی ہوں آج آپ کو بُری لگ جاتی ہے۔ اپنا وطن چھوڑتے میرا جی ویسے ہی اداس ہے اس پر سے آپ ـــ

ضیائی :۔ (صوفے کے قریب بہ مشکل آ کر اسے تھامتے ہوئے) اس شہر میں رہتے ہوئے بھی آپ میرے لئے تو ہمیشہ کوسوں دور رہیں۔

بیگم :۔ (معصومیت سے) اے لیجئے ڈراموں میں تو آپ ملتے ہی رہتے تھے۔ آپ تو آج ہر بات کی تردید کرنے پر اترے ہوئے ہیں (روہانسی ہو کر) میں اپنا سمجھ کر بات کرتی ہوں اور آپ غیروں کی طرح ہر بات پکڑ لیتے ہیں۔

(بیگم منہ پھیر کر کھڑکی کے پردے کی طرف دیکھنے لگتی ہے)

ضیائی :۔ (ریشہ خطمی ہو کر چائے کی پیالی میز پر رکھتا ہے اور ہاتھ ملتے ہوئے) آپ۔ آپ مجھے اپنا

Scanned with CamScanner

سمجھتی ہیں ؟ اپنا ؟

بیگم :۔ جائیے اب ہم کوئی بات ہی نہ کرینگے ـــــ پاپا سے کہیں گے کہ آپ ـــــ

ضیائی :۔ (بیگم کے پیچھے کھڑے ہو کر) اب اعتراف کر کے چپ ہو جانا چاہتی ہیں۔

(بیگم جھٹکے سے مڑ کر ضیائی کی طرف حیرت سے دیکھتی ہے اور پھر گھبرا کر دیوان پر بیٹھ جاتی ہے)

بیگم :۔ (سوچتے ہوئے) اعتراف ! اعتراف ؟

ضیائی :۔ (کھڑکی کے پاس کھڑے کھڑے) ہاں تم اعتراف کر چکی ہو۔ چھپاؤ نہیں ـــــ آج میں بھی اعتراف کر لوں کہ میں ہمیشہ تم سے محبت کرتا رہا ہوں۔

بیگم :۔ (دیوان سے ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے) محبت ؟

(دوبارہ دیوان پر بیٹھ کر تصویرِ حیرت بن جاتی ہے)

ضیائی :۔ (کمرے میں والہانہ انداز سے ٹہلتے ہوئے) مجھے یاد ہے جیسے یہ کل کی بات ہو۔ میں پہلی بار تمہارے پاپا کے ساتھ تمہارے گھر گیا تھا۔ اور میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ جھبرے جھبرے سنہرے بالوں والی چھوٹی سی لڑکی کو، جو ایک دم ڈرائنگ روم میں آگئی تھی کیونکہ اسے بک شیلف میں البسن کے "دی ماسٹر بلڈر" کی تلاش تھی۔ اُن بڑی بڑی بھوری آنکھوں نے کیسی بے اعتنائی سے ایک اجنبی کو دیکھا تھا۔ (سینے پر ہاتھ رکھ کر) اور پھر وہ کتاب لے کر اندر بھاگ گئی تھی ـــــ جونیر کیمبرج کی طالبہ البسن پڑھنے کو لے گئی تھی ـــــ اور میں اس لڑکی کی ذہانت پر حیران رہ گیا تھا ـــــ (لمبی سانس لے کر) مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔

بیگم :۔ (بڑے عزم سے کھڑے ہو کر) مجھے بھی سب باتیں یاد ہیں (ایک دم موڈ بدل کر رومینٹک انداز سے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے) اس دن ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں اور سردی بڑے زور کی تھی اور آپ ایک دم رضا صاحب کو ہمارے ہاں لے آئے تھے ـــــ ایسے پیارے لگ رہے تھے رضا صاحب کہ مجھے اب تک یاد ہے ـــــ آپنے اُن کے سامنے میری اتنی تعریفیں کی تھیں کہ میں کچھ بول ہی نہ سکی۔

Scanned with CamScanner

مجھے یاد ہے اس دن کڑاکے کی دھوپ تھی جب آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ پگلی لڑکی رضا تجھ سے پیار کرتا ہے۔

اور مجھے یاد ہے اس دن خوب ٹوٹ کر بارش ہو رہی تھی جب آپ نے پاپا سے رضا صاحب کو دامادی میں قبول کرنے کی سفارش کی تھی۔

(ہنس کر) دیکھئے میرا حافظہ بھی ایسا خراب نہیں۔

ضیائی:۔ (اسی والہانہ انداز سے ٹہلتے ہوئے) تمہاری آنکھوں کی اجنبیت میرے لئے ناقابلِ شکست پہاڑ کی چوٹی بن گئی۔ میں نے دیکھا کہ تم رضا سے محبت کرنے لگی ہو تو مجھے اپنی شخصیت رضا کی شخصیت میں جذب ہوتی محسوس ہوئی۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ رضا کے سامنے تمہیں موم ہوتے دیکھ کر میری انا کو کیسی تسکین ہوتی۔ تم رضا کی طرف دیکھتیں تو مجھے لگتا کہ یہ نظریں میرے دل میں اتر گئیں ہیں ـــــ تم ڈراموں سے دلچسپی لیتیں میں بھی اسٹیج کا دیوانہ ہو گیا اور اس طرح میں نے تصور ہی تصور میں تمہیں جیت لیا (جیب سے عینک نکال کر لگاتے ہوئے) تم میری محبت کو نہیں دیکھ سکتیں ـــــ شہنو۔

بیگم:۔ (مسکراہٹ دبا کر) کیا اس کے لئے عینک ضروری ہے؟

ضیائی:۔ (تڑپ کر) تم میرا مذاق اڑا رہی ہو ـــــ لیکن محبت کو سمجھنا بڑے ذہنوں کا کام ہے۔ اس ننھی سی شوخ شہناز کا نہیں۔

بیگم:۔ (بے حد سنجیدگی سے) واہ سمجھتی کیوں نہیں ـــــ نمبر ایک۔ آپ رضا کو میرے ہاں اس لئے لائے تھے کہ میری نظریں آپ کے دل میں اتر جائیں ـــــ نمبر دو آپ مجھے رضا سے محبت کرتے دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔

ضیائی:۔ ہاں یہ سوچ کر خوش ہوتا کہ تم کسی کے سامنے تو جھک گئی ہو اور اس طرح میں تصور ہی تصور میں رضا کی جگہ لے لیتا۔

بیگم:۔ (خوف زدہ ہو کر) اوہ سمجھ گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ رضا بن جاتے؟ (ایک ہاتھ کی انگشت شہادت دوسرے ہاتھ کی انگشت شہادت پر مار کر) اور میں؟ ـــــ میں آپ کی بیوی کا روپ دھار لیتی ہوں گی؟ ـــــ (انگلی کو دوسری انگلی پر پلٹ کر)

Scanned with CamScanner

اس طرح تو اس دوران میں آپ کے ہاں جو مزید تین بیٹیاں پیدا ہوئیں وہ گویا مجھ سے ہوئیں (ایک دم زور سے ہنستی ہے)

ضیائی :- انسانی مجبوری پر ہنستی ہو (اپنے ہاتھوں میں سر تھام لیتے ہیں)

بیگم :- (ایک دم سنجیدہ ہو کر) بعض اوقات ہنسی آنسوؤں کی ترجمان ہوتی ہے ضیائی صاحب۔ یہ آپ کی انسانی مجبوری تھی کہ آپ مجھ سے وہ بات کہہ دیں جو اب نہیں کہنا چاہئے تھی (کھڑے ہو کر ٹرالی پر ہاتھ رکھتے ہوئے جیسے ڈرامہ بول رہی ہو) اگر آپ رضا کو مجھ سے نہ ملاتے تو شاید میں آپ سے متاثر ہو جاتی۔ (رومینٹک انداز سے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے) اس زمانے میں مجھے ابسن کی ہلڈا بہت اچھی لگتی تھی۔ ہلڈا جو نوعمر تھی۔ لیکن معمر "ماسٹر بلڈر" کو اپنے اشارے پر چلا کر خوش ہونا چاہتی تھی۔ جس نے موت کی کھائی کے اس پار "ماسٹر بلڈر" سے اپنی موعودہ سلطنت مانگی تھی۔

ضیائی :- (صوفے پر بیٹھ کر سر دونوں ہاتھوں میں لے کر) میں کتنا بدنصیب اور بزدل تھا میں نے سوچا کہاں تم ایک ننھا سا بے تاب ستارہ اور کہاں میں غروب ہوتا ہوا آفتاب — میرا تمہارا کیا میل ؟

بیگم :- (طنطنے سے) آگے چل کر آپ کا خیال زیادہ صحیح ثابت ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ ابسن کی ہلڈا بھی ڈرامے میں اتنی نوعمر تھی کہ اپنے سلسلے میں کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر سکتی تھی (اطمینان سے کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

ضیائی :- مگر اب تو تم اعتراف کر چکی ہو — اب تم ننھی سی شہنو نہیں رہیں — بولو (وارفتگی سے کھڑے ہو کر) میں تمہارے لئے شہرت کی ایک جنت تعمیر کر دوں گا۔ میں تمہیں آسمان شہرت کا لازوال ستارہ بنا دوں گا۔

(بیگم کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھنا چاہتا ہے۔ بیگم کترا کر اٹھتی ہے اور کھڑکی کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو جاتی ہے۔ چہرے پر ناگواری ہے۔ ضیائی اس کے پیچھے جا کر کھڑا ہوتا ہے اسی لمحے فدا اپنے مخصوص انداز سے کندھے پر نیپکن رکھتا اور اٹھاتا اندر

عقبی دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ اور پیالی اٹھا کر ضیائی کی پشت پر کھڑا ہو جاتا ہے)

ضیائی:۔ میں تمہارے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں شہنو۔ میں موت کی کھائی میں چھلانگ لگا سکتا ہوں۔

فدا:۔ (دھیمی آواز میں) حضور اس وقت تو چائے پی لیجئے۔ بڑا احسان ہوگا۔ برتن بند کرنا ہیں۔

(بیگم اور ضیائی چونک کر فدا کی طرف مڑتے ہیں۔ بیگم شرمندہ سی ہو کر دیوان کی طرف لپکتی ہے اور سوئیٹر بننے بیٹھ جاتی ہے لیکن ضیائی بے حد شفقت سے فدا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔)

ضیائی:۔ میں پی چکا فدا۔ میں سرشار ہوں۔

فدا:۔ (مودب طریقے سے) بے شک حضور۔ مگر یہ پیالی بھری ہوئی ہے اس لئے سمجھا کہ حضور ٹھنڈی کر کے پیتے ہوں گے۔

بیگم:۔ (جھجھلا کر) بحث نہ کرو فدو بابا۔ ٹرالی لے جاؤ۔ ضیائی صاحب چائے نہیں پئیں گے۔

فدا:۔ یہ بات تو ہے حضور۔ (ٹرالی ڈھکیلتا باہر چلا جاتا ہے)

(بیگم کچھ پریشان سی ہو کر تیزی سے ٹہلنگ کرتی ہے۔ ضیائی دور کھڑا اپنے کوٹ کا کالر پکڑے اُسے میٹھی نظروں سے دیکھتا ہے اور بار بار اپنی عینک ناک پر درست کرتا ہے۔")

ضیائی:۔ تم یوں بھی کتنی حسین لگ رہی ہو شہناز۔

چیری:۔ (بائیں ہاتھ کے دروازے سے اندر آ کر بڑے اعتماد سے) بالکل نہیں ضیائی انکل۔ (گردن ادھر اُدھر گھما کر بیگم کو دیکھتے ہوئے) دیکھئے اس اینگل سے ممی کی ناک کتنی لمبی لگتی ہے ڈیڈی اس اینگل سے ممی کا فوٹو کبھی نہیں لیتے۔

(دونوں گڑبڑا جاتے ہیں اور چیری چاروں طرف دیکھنے لگتا ہے۔)

میری چائے کہاں ہے ممی؟

Scanned with CamScanner

بیگم :- (غصے سے مگر چہرہ سنبھالے ہوئے) میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہیں چائے نہیں ملے گی۔ پھر کیوں آئے ہو۔

جیری :- سوری ممی۔ میں رات کو کھانا بھی نہیں کھاؤں گا اب۔

(منہ پھلائے چلا جاتا ہے)

ضیائی :- (بائیں ہاتھ کے دروازے کی طرف دیکھ کر) میں فیصلہ کر چکا ہوں شہنو۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ ہے شہنو ــــ

فدا :- (عقبی دروازے سے ایک دم اندر آ کر خوشی سے) فیصلہ ہونے میں کیا رکھا ہے حضور۔ بٹیا بیگم تو آپ کے حق میں ہیں ہی اور یہ فیصلے بیگمیں کرتی ہیں۔ صاحب لوگ تو بیچارے ــــ (ضیائی ٹھٹھک کر فدا کو دیکھتا ہے)

بیگم :- (سلائیاں روک کر انتہائی حیرانی سے) فِدّو بابا!

فدا :- (رازدارانہ طریقے پر) حضور اپنے ضیائی صاحب سے بڑھ کر کون حق دار ہو سکتا ہے۔

(ضیائی خوش ہو کر تائید میں سر ہلاتے ہیں)

بیگم :- فِدّو !! (مٹھیاں باندھ کر فدا کی طرف لپکتی ہے فدا ڈر کر پیچھے ہٹتا ہے)

فدا :- (ضیائی سے مخاطب ہو کر) لیجئے، دیکھئے ہاتھ اٹھانے لگیں۔ خدا کی قسم گودیوں میں کھلایا ہے اتی سی تھیں ــــ (اور پیچھے ہٹ کر) کیا مجھے خبر نہیں کہ آپ کے حق میں فیصلہ کئے بیٹھی تھیں۔ اب منہ پر ہاں کہنے کا وقت آیا تو ــــ

ضیائی :- (بپھری ہوئی بیگم کے سامنے فدا کی ڈھال بنتے ہوئے) تو گویا تم ہماری باتیں سن رہے تھے فِدّو میاں ــــ ہوں؟

فدا :- اجی جناب چھپ کر سننے والے پر لعنت۔ اندر آ رہا تھا تو کان میں پڑ گئی۔ ویسے بٹیا بیگم مجھ سے چھپاتی کیا ہیں۔ پوچھ لیجئے ان سے ــــ

بیگم :- (چیخ کر) فِدّو کے بچے کمبخت ــــ (مارنے کے لئے فدا کی طرف بڑھتی ہے لیکن فدا ضیائی کو ہینیرے بدل بدل کر ڈھال بنائے رکھتا ہے)

ضیائی :- شہنو بچہ نہ بنو ــــ بگڑ کیوں رہی ہو اس بے چارے پر ــــ کوئی تو ہمراز ہو۔ پھر یہ

تو تمہارا پرانا نمک خوار ہے۔

بیگم:۔ (پاؤں پٹخ کر) ضیائی صاحب ـــ ہوش کی دوا کیجئے۔

فدا۔ اجی بٹیا کیوں گھبراتی ہیں، مرد آدمی فیصلہ کر کے پیچھے نہیں ہٹتے۔ ابھی آپ سے کہہ نہیں رہے تھے کہ میں فیصلہ کر چکا ـــ اب تم بتاؤ ـــ

(بیگم ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا کر رہ جاتی ہے)

ضیائی۔ (اطمینان کی سانس لے کر) پھر تمہاری بھی وہی رائے ہے جو میری ہے؟ (فدا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر) کیوں فدّو میاں زندگی میں خوشی بڑی چیز ہے نا۔ خواہ اس کے لئے کچھ بھی قربان کرنا پڑے۔

بیگم:۔ (مٹھیاں اپنے زانو پر مار کر) ضیائی صاحب (سر پکڑ کر دیوان پر بیٹھ جاتی ہے)

فدا:۔ (پریشان ہو کر) لیجئے سر پکڑ کر بیٹھ گئیں ـــ (نیکن دوسرے کندھے پر رکھ کر) حضور خواہ مخواہ میں بنے میاں کو بھی اپنے پیچھے لگا لیا بٹیا بیگم نے ـــ دیکھ لیجئے اس وقت بھی آئے کھڑے ہیں باہر۔ اجی صورت دیکھیں اپنی حیثیت دیکھیں اپنی۔ کہاں ضیائی صاحب، کہاں بنے میاں ـــ

(بیگم بے بسی سے سر اٹھا کر دونوں کو دیکھتی ہے اور پھر سر پکڑ لیتی ہے)

ضیائی:۔ (دانت پیس کر) بنے میاں ـــ تو بنے میاں بھی ـــ ہوں۔ ڈراموں کے سیٹ کیا تیار کرنے لگے کہ امیدوار بھی ہو گئے۔

(ضیائی سینہ تان کر بائیں ہاتھ والے دروازے کی طرف بڑے جوش سے بڑھتا ہے۔ فدا نہ نہ، کرتا دوڑ کر دروازہ روک لیتا ہے اور بیگم سینے پر ہاتھ رکھ کر گھبرائی کھڑی ہو جاتی ہے)

فدا:۔ اجی حضور بنے میاں سے آپ کو کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ بٹیا بیگم کی طرف سے آپ کے حق میں فیصلہ ہے۔

بیگم:۔ (دوبارہ دانت کٹکٹا کر) فدّو۔ کمبخت ـــ گدھے (پھر دیوان پر بے بسی سے بیٹھ کر ہاتھ ملتی ہے)

Scanned with CamScanner

فرداد:۔ (اسی اطمینان سے) اور کیا جیتنے والے کو ہارنے والے سے کیا غرض۔ ہم سب جانتے ہیں کہ بٹیا بیگم کا فیصلہ کیا ہے۔ صاحب بھی جانتے ہیں —— (باہر کی طرف حقارت سے اشارے کر کے) منہ بڑے آئے بنتے میاں۔ میں جا کر خود انہیں جواب دیئے دیتا ہوں کہ موٹر کا سودا ہو گیا۔

(نہایت فاتحانہ شان سے سینہ تان کر دروازے کی طرف جاتا ہے۔ بیگم اطمینان کی لمبی سانس کھڑے ہو کر لیتی ہے اور پھر جیسے دیوان پر گر پڑتی ہے۔ ضیائی بھی ٹھنڈا ہو کر صوفے پر ڈھے جاتا ہے۔ اور کانپتے ہاتھوں سے جیب سے سگار نکال کر ہر طرف دیکھتا ہے۔)

بیگم:۔ (ماتھے پر ہاتھ پھیر کر) یہ آپ کیا کر رہے تھے ضیائی صاحب۔ شکر ہے کہ فدو بابا کچھ نہیں سمجھا۔ حد ہو گئی بھئی آپ نوکر کے سامنے میری اتنی بے عزتی کر رہے تھے۔

ضیائی:۔ (ہاتھ کا بے جلا سگار جیب میں ٹھونس کر) بے عزتی! میں تمہارے لئے بے عزتی کا باعث ہوں گا شہنو؟ —— یہ تم کیا کہہ رہی ہو —— سوسائٹی میں خاصا باعزت آدمی شمار ہوتا ہوں۔

بیگم:۔ (گھبرا کر مگر مضبوط لہجے میں) اوہ میرا مطلب ہے (دیوان سے اٹھ کر صوفے کے قریب ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے) میرا مطلب ہے کہ آپ ہمیشہ وقت پر وہ بات سمجھتے ہیں جو نہیں سمجھنا چاہیے —— (دھیمی آواز میں مگر یقین سے) دیکھیے ضیائی صاحب میں اب وہ جھبڑے جھبڑے بالوں والی جونیئر کیمبرج کی اسٹوڈنٹ نہیں —— میں مسز رضا ہوں۔ اور —— اور رضا سے محبت کرتی ہوں۔

ضیائی:۔ (بے اختیار کھڑے ہو کر) اس کا مطلب ہے کہ تم جھوٹ بول رہی تھیں۔

بیگم:۔ میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔

ضیائی:۔ (بیگم کی کرسی پر جھکتے ہوئے) شہنو

بیگم:۔ (کرسی پر سے کترا کر اٹھتے ہوئے) ضیائی صاحب دیکھیے ابھی میں نے کتنی صحیح بات کہی تھی۔ کہ آپ ہمیشہ وقت پر وہ بات سمجھتے ہیں جو نہیں سمجھنا چاہیے (ڈرامائی انداز سے) ہیں

Scanned with CamScanner

ہمیشہ رضا سے محبت کرتی رہی ہوں اور اب بھی کروں گی ۔۔۔ میں آپ کی عزت کرتی تھی اب اور زیادہ عزت کروں گی ۔ شاید آج کے بعد آپ کے نام پر مجھے ایک کسک سی بھی محسوس ہو ۔ میں امریکہ کی نئی دنیا میں بھی اپنے "ماسٹر بلڈر" کو یاد کرتی رہوں گی (دھیمی آواز میں چھت کی طرف دیکھتے ہوئے) ہمیشہ یاد کروں گی ۔ لیکن اس طرح نہیں جیسے آپ چاہتے ہیں ۔ میں عورت ہوں ضیائی صاحب عورت ۔۔۔ کہتے ہیں مرد تمام عمر گھر کی دیواریں توڑنے کے لئے بے تاب رہتا ہے لیکن عورت تمام عمر دیواروں کو لیس پوت کر مضبوط کرتی رہتی ہے (مسکرا کر) اگر آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں تو مجھے رضا کے ساتھ خوش دیکھ کر آپ کو خوش ہونا چاہیئے ۔

ضیائی :۔ (بیگم کی طرف بڑھتے ہوئے) میں خوش ہوں گا میری بلڈا ۔۔۔ میں تو تمہاری خاطر موت کی کھائی میں بھی چھلانگ لگا سکتا ہوں ۔

بیگم :۔ (ایک دم پیچھے ہٹ کر) اوہ ۔۔۔ آپ کتنے عظیم ہیں (اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر ایک زوردار سسکی لیتی ہے) آپ ۔۔۔ میری یادوں کا سرمایہ ہیں ۔ آپ ۔۔۔

ضیائی :۔ (جیب سے رومال کھینچ کر) ارے ۔ ارے شہنو تم رو رہی ہو ؟ میں تمہارے آنسو نہیں دیکھ سکتا ۔۔۔ (رومال سے آنسو پونچھنا چاہتا ہے)

بیگم :۔ (رومال جھپٹ کر اور پیچھے ہٹتے ہوئے) میں جا رہی ہوں ۔

ضیائی :۔ (رقت سے) تم کہیں ہو ۔ دنیا کے کسی کنارے پر ۔ تم مجھ سے قریب ہو گی ۔

بیگم :۔ (رومال سے آنکھیں رگڑتے ہوئے) میرے ڈرامہ سرکل کی خبر رکھئے گا ۔ مس رحمان کو زیادہ بلڈ اپ نہ ہونے دیجئے گا ۔

ضیائی :۔ تمہارا ڈرامہ سرکل مجھے جان سے زیادہ عزیز رہے گا شہنو ۔۔۔ اور رہی مس رحمان اس سے تو مجھے یوں ہی نفرت ہے ۔ تم رو نہیں ۔

بیگم :۔ (دو چار سسکیاں لے کر) میری موٹر کو ٹھیک سے رکھئے گا ۔

ضیائی :۔ (بڑے جوش سے مگر بھرائی ہوئی آواز میں) کل سے تمہاری موٹر میرے پاس ہے ۔ دیکھ لو جا کر، کوئی خرابی ہوئی اس میں ؟

Scanned with CamScanner

بیگم :۔ (رومال سے ناک پونچھ کر اور ٹھنڈی سانس لے کر) خرابی نہیں ہوئی تو آئندہ ہو جائے گی۔

ضیائی ۔ (دور ہٹ کر) کیسے کیا انجن میں کچھ گڑبڑ ہے ؟

بیگم :۔ (رقت سے) اگر آپ نے اگلی سیٹ پر اپنی چارمن کی بیگم صاحبہ کو بٹھایا تو خرابی نہیں ہوگی۔

ضیائی :۔ اوہ (مسکرا کر ذرا قریب آتا ہے)

بیگم :۔ (اسی غمگین انداز سے) اس موٹر کی اگلی سیٹ پر میں رضا کے پہلو میں بیٹھا کرتی تھی تو کیسا اچھا لگتا تھا۔ اور اب وہ بیٹھیں گی آپ کی بیگم ——

ضیائی :۔ (شہیدانہ عزم سے) نہیں بیٹھے گی کبھی نہیں۔ تمہاری جگہ وہ کبھی نہیں لے سکتی۔ اب میں ڈرائیو کروں گا اور تم امریکہ میں رہ کر بھی میرے ساتھ بیٹھی ہو گی۔ تصور تو کسی کی ملکیت نہیں شہنو۔ (لمبی سانس لے کر چھت کی طرف دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے)

بیگم :۔ (رومال دوبارہ آنکھوں کی طرف لے جا کر) وہ جو موٹر کے شیشے پر جاپانی لباس والی گڑیا لٹکی ہے وہ اتار کر پھینک دی جائے گی۔

ضیائی :۔ کون کہہ رہا ہے ؟

بیگم :۔ (سسکتے ہوئے) کوئی کہے یا نہ کہے۔ مجھے معلوم ہے کیونکہ آپ کی یاسمین بیٹی کو نکٹے چپٹے جاپانی بُرے لگتے ہیں۔ ایک دن کہہ رہی تھیں کہ یہ گڑیا کیوں لٹکائی ہے موٹر میں —— ہائے ایسی پیاری تو ہے وہ گڑیا۔ رضا میرے لئے جاپان سے لائے تھے۔

(لمبی سانس لے کر اطمینان سے صوفے پر بیٹھ جاتی ہے اور رومال سے کھیلنے لگتی ہے)

ضیائی :۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) اس موٹر کے سلسلے میں تمہاری جذباتی وابستگیوں کو ٹھیس نہ لگنے دوں گا شہنو —— یہ فخر میرے لئے کچھ کم نہیں ہوگا کہ میں تمہاری جذباتی وابستگیوں کا محافظ ہوں —— اس موٹر میں بیٹھ کر میں تمہارے قریب ہوں گا —— میں جب چاہوں گا تصور میں تمہیں سینے سے لگاؤں گا۔ پھر تم مجھ سے یوں نہ بھاگو گی۔

بیگم :۔ (ذرا اجنبیت سے) ایسی باتیں نہ کیجئے میں بُرا مان جاؤں گی۔

(فدا کے اندر آنے سے قبل ہی باہر سے مکالمہ شروع ہوتا ہے)

فدا:۔ اجی میں نے صاف جواب دے دیا (اندر آکر) کہنے لگے بارہ ہزار دوں گا، بیگم صاحبہ سے کہہ دو۔ میں نے کہا ہوا کھاؤ بنے میاں۔ بارہ ہزار پر تو پہلے ہی سودا ہو گیا ضیائی صاحب سے (نیپکن کی نشست بدلتے ہوئے) اتنا سا منہ نکل آیا میاں آرٹش، (آرٹسٹ کا۔ منہ بڑے آئے موٹر لیں گے کل تک جوتیاں چٹخاتے پھرتے تھے منہ دھو آئیں ہمارے صاحب کی موٹر لیں گے۔ اجی موٹر بے سکتے ہیں تو ہمارے ضیائی صاحب۔ پوتڑوں کے رئیس تھے کسی زمانے میں۔ جی ہاں ـــــ (ضیائی کی طرف جھک کر) حضور موٹر پہ کپڑا مار دوں؟

ضیائی:۔ (بجھے ہوئے لہجے میں) آں؟ ہاں۔

(فدا جاتا ہے)

یہ ۵۸ء کا ماڈل ہے نا شہنو۔

بیگم:۔ (سوئیٹر اور سلائیاں اٹھا کر) لیجئے۔ آپ اور کیا یاد رکھیں گے بھلا؟ کل سے موٹر لئے گھوم رہے ہیں اور یہ بھی بھول گئے کہ ۵۷ء کا ماڈل ہے ـــــ یاد نہیں کتنے انتظار کے بعد تو لائسنس ملا تھا ـــــ ہائے مجھے اس موٹر سے کتنی محبت تھی۔ میں اسے اپنے ہاتھ سے پالش کرتی۔ کبھی میں نے اس میں موٹے لوگوں کو لفٹ نہ دی کہ اسپرنگ نہ ڈھیلے ہو جائیں اور رضا صاحب اتنے محتاط کہ اسے خراب سڑک تک پر نہ لے جاتے خواہ کتنا ہی چکر کاٹ کر گھر آنا پڑتا۔

ضیائی:۔ (گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر آگے کی طرف جھکتے ہوئے) ویسے اس کا ایک ایکسیڈنٹ بھی تو ہو چکا ہے۔

بیگم:۔ (سلائیاں روک کر) ایکسیڈنٹ۔ کب؟ اوہ اچھا یاد آیا۔ وہ۔ وہ تو معمولی سی ٹکر تھی۔ مڈگارڈ ذرا سا پچک گیا تھا۔ فوراً ٹھیک کروا لیا تھا۔

ضیائی:۔ ہاں واقعی پتہ بھی نہیں لگتا کہ ایکسیڈنٹ والی گاڑی ہے۔

بیگم:۔ بالکل نئی گاڑی لگتی ہے۔ بلکہ سال ڈیڑھ سال چلی ہوئی گاڑی کو آج کل پرانا ہی کون

کہتا ہے۔ رضا کے ایک دوست تیرہ ہزار دینے کو تیار تھے۔

ضیائی:۔ (صوفے پر آرام سے ٹک کر) تو انہی کو دے دی ہوتی شہنو۔

بیگم:۔ (پیار سے) کیسے دے دیتی ضیائی صاحب۔ میں نے رضا سے کہا کہ پہلے ضیائی صاحب نے موٹر مانگی ہے اس لئے انہی کو دیدی جائے گی ـــــ اور پھر دیکھئے کوئی دوسرا اس موٹر کے سلسلے میں میری جذباتی وابستگیوں کا خیال کیسے رکھتا؟

ضیائی:۔ (لمبی سانس لے کر) ہاں بات تو ٹھیک ہے مگر ایک بات کہتے ہوئے میں جھجک رہا تھا شہنو۔

بیگم:۔ ارے واہ مجھ سے بھی غیریت برت رہے ہیں آپ۔

ضیائی:۔ (بچوں کی طرح انگلیاں مروڑتے ہوئے) میرے پاس صرف گیارہ ہزار روپے ہیں۔

بیگم:۔ (سوئٹر ایک طرف رکھ کر) صرف گیارہ ہزار ـــــ پھر تو آپ کو ایک ہزار روپیہ قرض لینا پڑے گا۔ یہ تو بری بات ہے؟

ضیائی:۔ بری بات تو یہ ہے شہنو کہ میں قرض لینے کو اچھا نہیں سمجھتا۔ اگر تمہاری موٹر گیارہ ہزار کی ہوتی تب بھی۔

بیگم:۔ (دوبارہ سلائیاں اٹھا کر) میں نے تو رضا سے منوا لیا تھا کہ کار آپ کو بارہ ہزار میں ہی دیدیں۔ آپ نے پہلے خود ہی کہا تھا کہ بارہ ہزار میں دیدو (تیزی سے بنتی ہے)

ضیائی:۔ ہاں کہا تو تھا۔ پھر آج بینک بیلنس دیکھا تو خیال آیا (سنبھل کر) میں تمہاری کار کے سلسلے میں ذرا جذباتی ہوں نا شہنو ـــــ مجھے تو اس کا بھی خیال نہیں آیا کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہو چکا ہے۔

بیگم:۔ (ذرا تیز ہو کر) ارے پھر ایکسیڈنٹ کا ذکر لے بیٹھے آپ۔ میں کوئی آپ سے جھوٹ بول رہی ہوں کہ معمولی سی رگڑ لگی تھی۔ میں کوئی آپ کو لوٹنا چاہتی ہوں۔

ضیائی:۔ (جیب میں ہاتھ ڈال کر سگار نکالتے ہوئے) اب کیا لوٹو گی، لوٹ تو پہلے ہی لیا تھا۔ (سینے پر سگار سمیت ہاتھ رکھ کر) اب یہاں کیا رہ گیا ہے شہنو۔

بیگم:۔ (ضیائی کی طرف دیکھ کر کھلکھلا کر ہنستی ہے)

ضیائی :۔ (برا مان کر) ہنس رہی ہو (صوفے سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے جیسے ابھی چلا جائے گا۔ اسی لمحے عقبی دروازے پر فدا نمودار ہوتا ہے)

بیگم :۔ (ہنسی ضبط کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے) ہائے اللہ کیسے پرانے تھیٹریکل انداز سے باتیں کرتے ہیں آپ ـــ پھر کہتے ہیں ہنستی ہو۔

(پھر ہنسنا شروع کر دیتی ہے اور ضیائی بے بسی میں دھم سے صوفے پر بیٹھتا ہے)

فدا :۔ (دروازے کے پاس ہی سے دونوں ہاتھ اٹھائے اندر دوڑتا ہے) آہستہ ـــ حضور آہستہ۔ صوفے کا کوئی اسپرنگ ٹوٹ جائے گا۔

بیگم :۔ (غصے سے) فدّو بابا!

ضیائی :۔ (بوکھلا کر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

فدا :۔ نہیں حضور مطلب یہ ہے کہ بیٹھیے ضرور مگر ذرا خیال سے ـــ کوئی اسپرنگ ٹوٹ گیا تو بٹیا بیگم کی سہیلی بیگم ملک صوفے کی قیمت میں سے دس بیس روپے راتوں رات واپس منگوالیں گی۔

بیگم :۔ (غصے سے کھڑے ہو کر) تم پھر باتیں بنانے آگئے فدّو بابا۔ کوئی کام نہیں تم کو۔ اتنا کام پڑا ہے۔

فدا :۔ یہی بات تو میں کہہ رہا ہوں۔ کام ہی کرنے تو آیا ہوں۔ اتنی دیر سے ٹرک والوں کو بہلا رہا ہوں کہ ابھی سامان لدوا تے ہیں باقی کا ـــ مگر اب وہ جا رہے ہیں کہتے ہیں، کب تک انتظار کریں۔

بیگم :۔ (بوکھلا کر) ارے تو کس نے کہا تھا انتظار کروانے کو ـــ اٹھواؤ سامان۔

(فدا دروازے کے قریب جا کر اشارہ کرتا ہے دو مزدور اندر آتے ہیں۔ اور آتے ہی ضیائی کے دائیں بائیں کھڑے ہو جاتے ہیں فدا ایک "سیٹی" اٹھا کر بڑے ادب سے ضیائی کے سامنے پیش کرتا ہے اور ضیائی صوفے سے اٹھ کر "سیٹی" پر ٹک جاتا ہے۔ فدا سنیٹر

ٹیبل پر نیپکن کا ہاتھ مار کر اسے اٹھاتا ہے۔ دونوں مزدور صوفہ پکڑا کر فدا کے پیچھے چل دیتے ہیں۔ یہ سب چند لمحوں میں تیزی سے ہوتا ہے۔

(ٹھنڈی سانس لے کر ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) ہر چیز کوڑیوں کے مول گئی۔ پانچسو کا تو یہ صوفہ ہی بنوایا تھا۔

ضیائی:۔ (بے حد اسگار انگلیوں میں گھماتے ہوئے لمبی سانس لیکر ہاں۔ یہ تو ہوتا ہی ہے

(دوسری جیب میں ماچس تلاش کرنے کو ہاتھ ڈال کر نکال لیتا ہے)

بیگم:۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ایسا کیوں ہوتا ہے۔

ضیائی:۔ سیکنڈ ہینڈ جو ہو جاتا ہے سب سامان ـــــ اس لئے قیمت گر جاتی ہے۔

بیگم:۔ ہنھ ـــــ اسے سیکنڈ ہینڈ سامان کون کہے گا۔ دوکان پر دو برس چیز پڑی رہے تو قیمت نہیں گھٹتی۔

ضیائی:۔ دراصل لوگوں کی ذہنیت ہی خراب ہوتی ہے۔

بیگم:۔ اور کیا۔ بس لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ ہمیں چیزیں فروخت کرنا ہیں کیونکہ ہم باہر جا رہے ہیں اور ہمیں یہاں کچھ روپیہ بھی ادا کرنا ہے اس لئے ہر ایک سو کی چیز کے پچیس دینا چاہتا ہے۔ اب دیکھئے نا رضا صاحب کے دوست کسی دلاّل کے ذریعے کار خریدتے تو ایک دو سال چلی ہوئی کار کے چودہ ہزار روپے جیب سے جھاڑ دیتے مگر انہوں نے ہماری کار کے تیرہ ہزار روپے لگائے۔ اور بنّے میاں بارہ ہزار پر ضد کر رہے ہیں۔ وہ تو کہو آپ بیچ میں آ گئے ضیائی صاحب، اور کار ہم نے آپ کو دیدی۔

ضیائی:۔ (کھنکھار کر) شہناز بیگم! میری بات مانو گی۔

بیگم:۔ جی!

ضیائی:۔ میرا خیال ہے کہ موٹر تیرہ ہزار والے صاحب کو دے دو۔ میں اپنی وجہ سے تمہارا نقصان نہیں کرنا چاہتا۔

بیگم:۔ ارے آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے تو ویسے ہی ذکر کیا (مسکرا کر) آپ کو گیارہ

ہزار میں کار دے کر بھی مجھے نقصان کا احساس نہیں ہو گا ـــــ (سنجیدہ ہو کر) ویسے تیرہ ہزار والے صاحب کو تو رضا نے اسی دن جواب دے دیا تھا۔ جب آپ نے بارہ ہزار قیمت لگا کر موٹر خریدنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

ضیائی :۔ (سر ہلا کر) ہاں مجھے تمہاری موٹر سے دلچسپی تو ہے مگر تمہارا نقصان مجھے گوارا نہیں۔ پھر بنے میاں کے بارے میں کیا خیال ہے وہ تو بارہ ہزار دے رہے ہیں ؟

بیگم :۔ (دیوان پر دھم سے بیٹھ کر) ارے کیا ہو گیا ہے آپ کو ؟ ابھی فدو بابا نے آپ کے سامنے بنے میاں کو جواب نہیں دے دیا۔

ضیائی :۔ (بے جلا سگار دانتوں میں دبا کر) ارے ـ ہاں ـ واقعی یہ بات تو ہے۔

بیگم :۔ میں رضا صاحب سے کہوں تو وہ گیارہ ہزار پر آپ کی خاطر مان جائیں گے ـــــ

ضیائی :۔ (چونک کر) میری خاطر ؟ (آگے جھکتے ہوئے) ایک بات کہوں شہناز بیگم ؟ میں نے زندگی میں کسی کا احسان نہیں لیا۔ کڑے وقت میں بھی احسان لینے کو جی نہیں چاہا۔

بیگم :۔ (آنکھیں پھاڑ کر) احسان ؟ یہ احسان کہاں سے بیچ میں ٹپک پڑا ضیائی صاحب ؟ آپ نے خود ہی بارہ ہزار میں ہماری موٹر خریدنا چاہی۔ ہم مان گئے۔ جو گاہک تھے انہیں جواب دے دیا۔ آپ نے اب ایک ہزار گھٹا دیا۔ میں نے کہا کہ رضا سے منوا لوں گی تو آپ احسان نہ لینے کی دھمکی دے رہے ہیں۔

(مندرجہ بالا مکالمے کے دوران میں فدا دونوں مزدوروں کے ساتھ دوبارہ اندر آتا ہے۔ دونوں مزدور صوفے کے دونوں پیس اٹھا کر باہر جاتے ہیں اور فدا کونے کی میز اٹھائے ان کے پیچھے نکل جاتا ہے۔ اس دوران میں خاموشی کے لمحوں میں بیگم مضطربانہ طریقے سے سوئٹر بنتی ہے اور ضیائی بے جلے سگار کے کش لینا چاہتا ہے۔ لیکن اس کوشش میں ناکام ہو کر سگار کو اوپر کی جیب میں رکھ لیتا ہے اور اٹھ کر شہناز کے قریب جاتا ہے)

ضیائی :۔ شہناز بیگم تم برا مان گئیں۔ میں نے احسان کا ذکر یوں ہی احتیاطاً کہا تھا۔ مجھے

Scanned with CamScanner

معلوم ہے کہ تم چاہتی ہو تمہاری موٹر میرے پاس رہے ۔ در اصل میں خود شرمندہ ہوں میرے پاس روپے امید سے کم نکلے ۔ تم کہو تو میں بنے میاں سے خود کہہ دوں کہ وہ تمہاری موٹر خرید لیں۔

بیگم:۔ (بگڑ کر) رہنے دیجیے مجھے آپ کے احسان کی ضرورت نہیں۔ بڑے آئے بنے میاں لونگچڑے میری کار میں بیٹھیں گے ۔ (روٹھا منہ بنا کر تیزی سے ہنستی ہے)

صنیائی:۔ (لمبی سانس لے کر) ہاں یہ بات تو ہے۔

بیگم:۔ (اور بگڑ کر) کیا بات ہے؟

صنیائی:۔ یہی کہ بنے میاں لونگچڑے تمہاری موٹر میں بیٹھیں گے ۔

بیگم:۔ (اسی لہجے میں) آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں ۔ میرے جذبات کی ہتک کر رہے ہیں۔

صنیائی:۔ (سیٹی پر بے حد اطمینان سے بیٹھ کر) تم غصے میں بھی کتنی پیاری لگتی ہو؟

(اسی وقت فدا دونوں مزدوروں کے ساتھ اندر آتا ہے ایک مزدور ایک سیٹی اٹھاتا ہے ۔ دوسرا صنیائی کی پشت پر کھڑا ہو جاتا ہے ۔ فدا سینٹر ٹیبل کے ساتھ دونوں چھوٹے پیس اٹھا کر موقع کی نزاکت کا احساس کرتا ہے اور صنیائی کے سامنے جھک کر دونوں ہاتھوں سے مع ننھی تپائیوں کے اسے دیوان پر تشریف رکھنے کا اشارہ کرتا ہے صنیائی اٹھتا ہے تو مزدور جلدی سے صنیائی والی سیٹی اٹھا کر باہر جاتا ہے ۔ فدا اور مزدور اسکے پیچھے تیزی سے جاتے ہیں۔ یہ سارا عمل چند لمحوں میں تیزی سے ہوتا ہے۔

صنیائی، بیگم کی طرف دیکھتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ دیوان کے قریب پہنچ جاتا ہے)

(کھنکھار کر) شہناز بیگم فدا نے ادھر بیٹھنے کا حکم دیا ہے ۔ بیٹھ جاؤں ۔ یہ شرف یاد رکھوں گا۔

(بیگم ایک دم مسکرا دیتی ہے اور دیوان پر ذرا الگ ہٹ کر

بیٹھ جاتی ہے)

ضیائی:۔ (دیوان پر بیٹھتے ہوئے) غصے کے بعد مسکراتی ہو تو کتنی حسین لگتی ہو۔

(بیگم مسکراہٹ ضبط کرتے اور باوقار بننے کی کوشش کرتی ہے)

(ٹھنڈی سانس لے کر) اگر میرے پاس بارہ ہزار روپیہ ہوتے تو میں تمہارے یہ ہر آن بدلتے ہوئے روپ دیکھنے سے محروم رہ جاتا۔

بیگم:۔ (پیچھے کھسکتے ہوئے کچھ شرما کر) افوہ ابھی خواہ مخواہ ٹریجڈی طاری کر رہے ہیں اپنے اوپر۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ رضا گیارہ ہزار میں موٹر آپ کو دینے پر رضامند ہو جائیں گے۔

ضیائی:۔ (اور لمبی سانس لے کر) تم جیسی بیوی اپنے شوہر سے کیا کچھ نہیں منوا سکتی۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ گیارہ ہزار بینک میں میرے نام جمع تو ہیں لیکن وہ سب میرے نہیں۔

بیگم:۔ (سوئٹر اور سلائیاں ایک طرف رکھ کر اور دور ہٹتے ہوئے) جی ــــ جی کیا کہا آپ نے؟

ضیائی:۔ مسئلہ تو یہی ہے شہناز بیگم کہ میرے اکاؤنٹ میں ایک ہزار روپے جو اد بھائی نے امانتاً جمع کروائے تھے۔ آج صبح صبح کہنے آئے تھے کہ روپے نکلوا دو لڑکے کی ملازمت کے لئے ضمانت جمع کرانے ہے۔

بیگم:۔ (ایک دم کھڑے ہو کر خوابناک آواز میں) رہ گئے دس ہزار۔

ضیائی:۔ (مجرمانہ انداز سے سر جھکا کر) ہاں یہ بات تو ہے ــ (رکتے رکتے) اور تم جانتی ہو کہ میری بیوی چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانے میں کیسی استاد ہیں۔

بیگم: (اسٹیج کے آخری کونے پر آ کر) بے شک۔ بے شک (چھت کی طرف دیکھتی ہے)

ضیائی:۔ (سر جھکا کر مجرمانہ آواز میں) پانچ سو روپے اس نے جمع کرائے تھے میرے پاس ــــ موٹر خریدنے کا ذکر سنا تو کہنے لگی کہ میرے روپے دیدو۔ لڑکیوں کے کپڑے بنانے ہیں۔

بیگم:۔ (تیزی سے کھڑکی کی طرف جاتی ہے اور پھر وہاں کھڑے ہو کر) رہ گئے ساڑھے نو ہزار

(اپنی مٹھیاں ہسٹریا کے انداز سے بھینچ لیتی ہے)

ضیائی:۔ (معصومیت سے) ہاں یہ بات تو ہے شہنو۔

Scanned with CamScanner

بیگم :۔ (زور سے) اوہ ــــ

(مڑ کر میز تلاش کرتی ہے اور پھر دوڑ کر اپنی بندھی ہوئی مٹھیاں خالی بک شیلف پر دے مارتی ہے لیکن خود ہی اپنے ہاتھوں کی چوٹ سینکنے کو منہ سے گرم بھاپ دیتی ہے اور ضیائی کی طرف سے پیٹھ کر کے بک شیلف پر جھک جاتی ہے)

ضیائی :۔ ارے ــــ چہ چہ۔

(دیوان سے اٹھ کر دو چار قدم بیگم کی طرف بڑھتا ہے اور پھر افسوس سے سر ہلاتا وہیں جم کر رہ جاتا ہے اور اپنی جیبیں ٹٹولنے لگتا ہے۔ اس دوران میں مزدور عقبی دروازے سے کمرے میں جھانکتے ہیں اور دیوان خالی دیکھ کر اسے اٹھا کر کھسک لیتے ہیں)

ضیائی :۔ اچ ۔ چھا۔

(ٹھنڈی سانس لے کر الٹے قدموں چل کر دیوان پر بیٹھنا چاہتا ہے۔ لیکن دیوان کی عدم موجودگی محسوس کر کے سنبھل جاتا ہے اور بک شیلف پر جھکی ہوئی بیگم کو دیکھ کر بڑبڑانے لگتا ہے)

اور غصہ کرلو (لبسور کر) میرے پاس بارہ ہزار روپیہ ہوتا تو تمہیں مجھ پر اتنا غصہ کیوں آتا۔ اس ظالم معاشرے میں ہر چیز روپوں کی کمی یا زیادتی سے کھوئی اور خریدی جاسکتی ہے۔ میں تمہاری اتنی عزیز موٹر خریدنے کے لائق نہیں۔ میں تمہیں تصور میں بھی اپنے پہلو میں نہیں بٹھا سکتا۔ کیونکہ میرے پاس بارہ ہزار روپیہ نہیں (لمبی سانس لے کر) یہ ظالم معاشرہ ــــ

بیگم :۔ (بک شیلف پر مٹھیاں مار کر چیختے ہوئے) بند کیجیے اپنی یہ داستان۔

ضیائی :۔ (بیگم کی طرف دو قدم بمشکل بڑھ کر) یہ داستان کبھی ختم نہیں ہوگی۔ بیگم شہناز رضا۔ اس وقت میرا دل ٹوٹ گیا ہے (چھت کی طرف دیکھ کر) تمہارے رضا صاحب کے بینک بیلنس میں تین ہزار روپے کی کمی ہو جانا ہماری زندگی کی سب سے بڑی حقیقت

ہے اور اس حقیقت نے ہم دونوں کی دنیا ہی بدل دی۔

بیگم:۔ (بے صبری سے پلٹ کر بک شیلف پر کہنی رکھ کر) یہ تین ہزار، تین ہزار کی رٹ کیا لگا رکھی ہے جناب ــ ڈھائی ہزار کم کر رہے ہیں آپ۔ حساب جوڑ لیجئے۔ بینک میں آپ کے بارہ کے بجائے گیارہ ہزار نکلے؟ ایک ہزار یہ کم ہوا۔ ایک ہزار آپ کے جواد بھائی کے۔ کہئے دو ہزار ہوئے نا ــ پھر پانچسو آپ کی بیوی کے نکل گئے۔ ہو گئے ڈھائی ہزار ــ اب آپ باتوں باتوں میں پانچسو اور یوں اڑا گئے جیسے روپیہ نہ ہوا گھر کا کوڑا ہو گیا۔

ضیائی:۔ (سنجیدگی سے) روپیہ کوڑے سے بدتر نہیں تو کیا ہے۔ دنیا دیکھ رہی ہے کہ روپے کی قیمت پیسے برابر بھی نہیں رہی ــ تم نے اقتصادیات پڑھی ہوتی تو بات تمہاری سمجھ میں آتی۔

بیگم:۔ اچھا اچھا میں جاہل سہی ــ مجھے تو یہ بتائیے کہ حساب میں آپ نے بارہ ہزار سے ڈھائی ہزار نہیں گھٹائے؟ دو ہزار اور پانچسو کتنے ہوتے ہیں۔

ضیائی:۔ پورے تین ہزار (چھت کی طرف دیکھتے ہوئے) کیونکہ ساڑھے نو ہزار میں سے پانچسو میری بیٹی یاسمین کے ہیں ــ اور ....

بیگم:۔ (دانت بھینچ کر) اور ــ اور

(بیگم مٹھیاں بھینچ کر ضیائی کی طرف غصے میں بڑھتی ہے لیکن اندر آتے ہوئے فدا اور مزدوروں کو دیکھ کر بمشکل کھڑکی کی طرف منہ پھیر کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ دونوں مزدور مشین کی سی تیزی سے بک شیلف اٹھاتے ہیں فدا اس پر سے لڑھکتی ہوئی تصویر تھامتا ہے۔ نیکپن سے اسے جھاڑتا ہے اور چھت سے لو لگائے ہوئے ضیائی کے ہاتھ پر تصویر رکھ کر ہوا کی طرح باہر نکل جاتا ہے۔

(منہ پھیرے پھیرے سخت آواز میں) ضیائی صاحب۔

ضیائی:۔ (معصومیت سے تصویر کو تکتے ہوئے) جی، جی فرمایئے۔

Scanned with CamScanner

بیگم :۔ (منہ پھیرے پھیرے) دیکھئے ضیائی صاحب عین وقت پر آپ نے ہمارے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں ۔ آپ کو ۔۔۔ آپ کو میں ۔۔۔

ضیائی :۔ (جھجھت کی طرف دیکھ کر) شہناز بیگم اگر سب انسان ایک دوسرے کو سمجھ لیا کرتے تو یہ دنیا اتنی پیچیدہ نہ ہوتی ۔ آپ اگر یہ بات سمجھ لیتیں کہ مجھے آپ ہی نہیں، آپ کی ایک ایک چیز سے کتنا لگاؤ ہے، آپ کی موٹر مجھے کیوں عزیز ہے تو ۔۔۔

بیگم :۔ (ایک دم پلٹ کر بات کاٹتے ہوئے) ضیائی صاحب آپکے پاس چیک بک ہے اس وقت؟

ضیائی :۔ (اثبات میں سر ہلا کر لمبی سانس لیتا ہے) جی ۔

بیگم :۔ شکر ہے ۔۔۔ اچھا دیکھئے یہ ذمہ داری بھی میرے ہی سر ہو گی ۔ میں رضا صاحب کو بات سمجھا دوں گی ۔ آپ کے پاس نو ہزار آپ کے ہیں ۔ آپ اسی رقم کا چیک کاٹ دیجئے ۔ اور موٹر اپنے پاس ہی رہنے دیجئے ۔

(ضیائی بے حد سعادت مندی سے ایک ہاتھ سے بیگم کی تصویر سینے سے دبائے دوسرا ہاتھ جیب میں ڈالتا ہے ۔ ساری جیبیں ٹٹول کر آخر بے جلا سگار نکال کر مفکرانہ انداز سے دانتوں میں دبا لیتا ہے ۔ بیگم سوالیہ نشان بنی ضیائی کی طرف دیکھتی ہے ۔ اسی لمحے فدا کی رہنمائی میں دو نوں مزدور اندر آتے ہیں اور دونوں مل کر زمین پر بچھا ہوا قالین گول کرنا شروع کر دیتے ہیں ۔ بیگم خود ہی قالین پر سے ہٹ جاتی ہے ۔ لیکن ضیائی دانتوں میں بے جلا سگار دبائے بیگم کی تصویر کو دیکھنے اور مسکرانے میں مصروف رہتا ہے ۔ مزدور پھرتی سے قالین کو ضیائی کے قدموں تک گول کرنے کے بعد رک جاتے ہیں ۔ فدا دروازوں کے پردے اتار کر تہہ کر رہا ہے وہ پردہ ہاتھ میں لئے آگے آتا ہے اور پردے والا ہاتھ لہرا کر ننگی زمین کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ ضیائی کھنکھار کر قالین پر سے ہٹتا ہے ۔ مزدور قالین کندھے پر رکھ کر نکلتے ہیں اور ان کے پیچھے فدا پردے لئے ضیائی کو غور سے دیکھتا باہر چلا جاتا ہے)

بیگم :۔ ضیائی صاحب ابھی میں نے چند منٹ پہلے کیا کہا تھا۔

ضیائی :۔ غالباً چیک بک کے متعلق پوچھا تھا ـــ (آہستہ سے) کتنی خوبصورت تصویر ہے!

بیگم :۔ ضیائی صاحب میں پوچھ رہی ہوں کہ پھر وہ چیک بک کہاں گئی۔

ضیائی :۔ جیب میں ہو گی شہناز بیگم (آہستہ آہستہ قریب آتے ہوئے) مگر میں سوچتا ہوں شہناز بیگم اپنا پورا بینک بیلنس تمہارے میاں کے نام لکھ دوں تو میرے پاس موٹر کا انجن "اوور ہال" کرانے کے پیسے بھی نہ بچیں گے جب کہ موٹر کا ایکسیڈنٹ ہو چکا ہے۔ اگر تم برا نہ مانو اور بات سمجھنے کی کوشش کرو تو میں عرض کروں کہ میرے بینک میں۔

بیگم :۔ (غصے سے بے قابو ہو کر) آپ کے بینک میں خاک نہیں۔ بار بار ذکر نہ کیجئے بینک کا۔

ضیائی :۔ (برا مان کر) آپ میرے بینک بیلنس پر خاک ڈال رہی ہیں ـــ مجھے کوس رہی ہیں (چھت کی طرف دیکھ کر) صرف اس لئے نا کہ آپ سمجھتی ہیں موٹر نو ہزار میں بیچ کر مجھ پر احسان کر رہی ہیں۔ مگر میں نے بُرے سے بُرے وقت میں بھی کسی کا احسان نہیں لیا۔

بیگم :۔ (بے بس ہو کر) اور میں رضا سے کیا کہوں گی۔ میں نے کتنی حماقت کی آپ پر بھروسہ کر کے ـــ اب میری مجبوری دیکھ کر آپ ـــ

ضیائی :۔ (بات کاٹ کر بڑے افسوس سے) میں کسی کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا ـــ مجھے نہیں چاہیئے موٹر دوٹر ـــ میں آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ میں یہاں سے چلے جانے کی اذیت برداشت کروں گا مگر آپ کے آنسو مجھے گوارا نہیں ـــ

(ضیائی دروازے کی طرف آہستہ سے مڑتا ہے اسکے ہاتھوں میں بیگم کی تصویر ہے اور ہونٹوں میں بے حلاسگار۔ بیگم ضیائی کو جاتا دیکھتی ہے تو غصے سے بے قابو ہو کر مٹھیاں تانے ضیائی کی طرف بڑھتی ہے اسی لمحے چیری دائیں ہاتھ کے دروازے سے اندر آتا ہے اسکے ہاتھ میں دیا سلائی کی ڈبیہ ہے۔ بیگم جھجک کر رکتی ہے اور اپنا چہرہ معمول پر لانے کی کوشش میں بھدے طریقے سے مسکراتی ہے ضیائی چیری سے ڈبیہ مانگ کر اپنا سگار سلگا لیتا ہے اور بیگم کی تصویر

چیری کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے)

چیری:۔ تھینک یو الکل ضیائی۔

ضیائی:۔ (چیری کے ہاتھ میں دیاسلائی کی ڈبیہ دیکر) تھینک یو چیری۔

(ضیائی دروازے تک جاتا ہے)

ضیائی:۔ چیری بیٹے ممی سے کہو اگر موٹر آٹھ ہزار میں ہوتی تو میں ——

(بیگم بندھی ہوئی مٹھیاں رخساروں سے لگا کر جھک جاتی ہے اسی لمحے فدا کھڑکی کے باہر سے کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھ کر کمرے کا آخری پردہ اتارتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے دوبارہ سر کھڑکی میں ڈال کر پکارتا ہے۔

فدا:۔ اجی یہی تو میں کہہ رہا ہوں بٹیا بیگم۔

(بیگم چونک کر فدا کو دیکھتی ہے اور ایک قدم شدید غصے کے عالم میں فدا کی طرف بڑھتی ہے۔)

فدا:۔ (ڈر کر) اجی تو میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اتنی سی بات پوچھنا تھی کہ بنے میاں کو کیا جواب دے دوں۔ بڑی دیر سے باغ میں بیٹھے سوکھ رہے ہیں بے چارے آرٹسٹ صاحب۔

(سب فدا کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں —— ضیائی کے منہ سے سگار گر پڑتا ہے اور بیگم بے تحاشہ خوش ہو کر "فدو بابا" کہہ کر اس کی طرف بڑھتی ہے اور پردہ گر پڑتا ہے)

زہرِ عشق

مصنفہ:۔ ہاجرہ مسرور

مثنوی زہرِ عشق کے پسِ منظر پر تخلیق کیا ہوا بے مثال باتصویر اسٹیج ڈرامہ

جلد شائع ہو رہا ہے

ناشر۔ کتاب نما۔ ۱۷۰۔ انارکلی روڈ —— لاہور

الف

کہانیاں

(دوسری جلد)

ترتیب:

وحید انور
محمود علیم صدیقی

اردو کلاسک
۱/۴۲ نیو آنند نگر، سانتا کروز ایسٹ بمبئی 400055

Scanned with CamScanner

سرورق : ——— سعادت علی خاں

کتابت : ——— محمد غالب

طباعت : ——— نخشن فائن پرنٹنگ پریس مچھلی کمان حیدرآباد۔ ۲

سن اشاعت : ——— ۱۹۸۵ء

قیمت : ——— ۱۲۵ روپے

بیرون ملک : ——— ۲۰ ڈالر

فہرست

(ا)

افسانہ	نام	صفحہ
۱- افسانہ نگار خاتون اور جہلم کے سات پل	اوپندر ناتھ اشک	۹
۲- قید خانہ	احمد علی	۲۵
۳- بارہ گھنٹے	خواجہ احمد عباس	۳۶
۴- صرف ایک سگریٹ	راجندر سنگھ بیدی	۴۲
۵- اوورکوٹ	غلام عباس	۵۸
۶- چابڑے	عصمت چغتائی	۶۴
۷- سندرتا کا راکشس	ممتاز مفتی	۶۹
۸- پھیلتا ہوا کاجل	آغا بابر	۷۸
۹- مجبوریاں	احتشام حسین	۷۷
۱۰- عاشق ہے؟	محمد احسن فاروقی	۸۷
۱۱- الٹی قبر	ابراہیم جلیس	۹۶
۱۲- دیوار کے پیچھے	شوکت صدیقی	۱۰۶
۱۳- لونگ والی	غلام الثقلین نقوی	۱۱۴
۱۴- قمیص	کرتار سنگھ دگل	۱۲۰
۱۵- تلاش	قدرت اللہ شہاب	۱۲۶
۱۶- کسک	تسنیم سلیم چھتاری	۱۲۹
۱۷- دادا	خدیجہ مستور	۱۳۹
۱۸- مٹی میلے میں	ہاجرہ مسرور	۱۵۱
۱۹- سرکٹے بچے کی ہنسی	قرۃ العین حیدر	۱۶۲
۲۰- پنہارن	چندر کانت	۱۷۳
۲۱- بہر خشی	ناہید عالم	۱۸۰
۲۲- مفاد عامہ	حمید اختر	۱۸۵
۲۳- جگن ناتھ	کوشلیا اشک	۱۹۳
۲۴- وقت کا ناگ	ریوتی سرن شرما	۲۰۲
۲۵- عصمت فروش	یوسف منان	۲۰۷
۲۶- آئینہ	ممتاز شیریں	۲۱۳

Scanned with CamScanner

۲۷۔ صبح و شام	پریم ناتھ پردیسی	۲۲۹
۲۸۔ منزل منزل	اے حمید	۲۳۶
۲۹۔ قربانی کا بکرا	سید انور	۲۵۹
۳۰۔ چھید	اشفاق احمد	۲۶۳
۳۱۔ طلاق	کشمیری لال ذاکر	۲۷۷
۳۲۔ زمین کا دکھ	اقبال متین	۲۸۴
۳۳۔ اندو	جیلانی بانو	۲۹۱
۳۴۔ شکست	عزیز اثری	۲۹۵
۳۵۔ سنگی	کلام حیدری	۲۹۸
۳۶۔ جب ہم نہ ہوں گے	بشیشر پردیپ	۳۰۲
۳۷۔ سانجھی	قاسم محمود	۳۰۸
۳۸۔ ایک دن کا سلطان	مانک ٹالہ	۳۲۲
۳۹۔ سندر گلاب	رضیہ سجاد ظہیر	۳۲۷
۴۰۔ حقہ پانی	حمید کاشمیری	۳۳۱
۴۱۔ ادھ کھایا امرود	فضل الرحمٰن خاں	۳۴۴
۴۲۔ محلّب خیشہ	مسعود مفتی	۳۵۲
۴۳۔ بیالیس روپے	میرزا ریاض	۳۶۳
۴۴۔ مٹی کے تیل کا چولھا	قیوم راہی	۳۷۱
۴۵۔ پیاسی جھیل	شرون کمار ورما	۳۷۴
۴۶۔ تاثران	واجدہ تبسم	۳۹۱
۴۷۔ طوفان	رشیم گل	۳۹۶
۴۸۔ خوشبو کا گھاؤ	نوید انجم	۴۰۲
۴۹۔ توجہ کی طالب	بانو قدسیہ	۴۱۰
۵۰۔ بسیرے دی چڑی	سلیم اختر	۴۲۹
۵۱۔ بن باس	جمیلہ ہاشمی	۴۳۵
۵۲۔ ندی	عبداللہ حسین	۴۴۵
۵۳۔ باہر کفن سے پاؤں	عرش صدیقی	۴۷۲
۵۴۔ خون کی پگڈنڈی	صادق حسین	۴۷۹
۵۵۔ واماندگی شوق	فرخندہ لودھی	۴۸۸

۵۶۔ زرد دامنی کی خوشبو	منیر احمد شیخ	۴۹۸
۵۷۔ دانہ پانی	ستیش بترا	۵۰۱
۵۸۔ مالکن	قاضی عبدالستار	۵۰۵
۵۹۔ پتھر کی نسل	سیدہ حنا	۵۱۶
۶۰۔ پالتو کبوتر	انور عنایت اللہ	۵۲۳
۶۱۔ پریم	مستنصر حسین تارڑ	۵۳۰
۶۲۔ غبارِ شب	احمد سعدی	۵۴۸
۶۳۔ کاسنی کی کوکھ	عالم شاہ خاں	۵۵۸
۶۴۔ سرطان	قمر عباس ندیم	۵۷۱
۶۵۔ بکری کا بچی	کیول دھیر	۵۷۶
۶۶۔ ڈار سے بچھڑے	سید محمد اشرف	۵۸۴
۶۷۔ سنگ و زیست	سائرہ ہاشمی	۶۰۳
۶۸۔ اناج کی خوشبو	یونس جاوید	۶۱۴
۶۹۔ ہمارے دلی، ہمارا زمانہ	حسن منظر	۶۲۴
۷۰۔ غنڈوں کے باپ	تقی حسین خسرو	۶۳۹
۷۱۔ لالی	سعیدہ گزدر	۶۴۴
۷۲۔ عشق عشق	بشریٰ رحمن	۶۴۹
۷۳۔ جنازہ	محمود ایوبی	۶۵۶
۷۴۔ چھایا بھاسکر	ذکیہ مشہدی	۶۶۳
۷۵۔ سفر	فیروزہ خاں	۶۶۹

(۳)

۷۶۔ پھندنے	سعادت حسن منٹو	۶۷۶
۷۷۔ اندھیرے سے اندھیرے کی طرف	رام لال	۶۸۴
۷۸۔ گھوڑے	ہرچرن چاولہ	۶۸۵
۷۹۔ زرد کتے	انتظار حسین	۶۹۲
۸۰۔ مردہ گھوڑے کی آنکھیں	انور عظیم	۷۰۱
۸۱۔ جادو	جوگندر پال	۷۱۰
۸۲۔ آج	انور سجاد	۷۱۷

Scanned with CamScanner

۸۳۔ عیدگاہ	عابد سہیل	۷۳۹
۸۴۔ تہ در تہ دود	غیاث احمد گدی	۷۴۳
۸۵۔ ماچس	بلراج مینرا	۷۵۳
۸۶۔ تماشا	محمد منشا یاد	۷۵۹
۸۷۔ سبز زوال	آغا سہیل	۷۶۶
۸۸۔ سناٹا بولتا ہے	رشید امجد	۷۷۰
۸۹۔ بچھڑنے کا گیت	مسعود اشعر	۷۷۵
۹۰۔ بے زمینی	احمد ہمیش	۷۸۴
۹۱۔ گاڑی بھر رسد	سریندر پرکاش	۷۹۱
۹۲۔ بارش کا آخری قطرہ	رضیہ فصیح احمد	۷۹۵
۹۳۔ پنجرے کا آدمی	رتن سنگھ	۷۹۹
۹۴۔ پیشاب گھر آگے ہے	اقبال مجید	۸۰۲
۹۵۔ سایہ	خالدہ اصغر	۸۰۶
۹۶۔ معتوب شہر	مشتاق قمر	۸۱۲
۹۷۔ نصیفٹی	افسر آذر	۸۱۷
۹۸۔ زرد بُلائیں، زرد آوازیں	زاہدہ حنا	۸۲۴
۹۹۔ رات والا اجنبی	عوض سعید	۸۴۴
۱۰۰۔ سبز پرندوں کا سفر	شفیع مشہدی	۸۴۷
۱۰۱۔ وہسکی اور پرندے کا گوشت	احمد داؤد	۸۵۱
۱۰۲۔ دنگا	سلام بن رزاق	۸۵۷
۱۰۳۔ حکم نامہ	مرزا حامد بیگ	۸۶۲
۱۰۴۔ کنوئیں سے ڈھکا آسمان	انور خان	۸۶۵
۱۰۵۔ کولہو کے بیل	احمد جاوید	۸۶۹
۱۰۶۔ چاندنی کے سپرد	انور قمر	۸۷۲
۱۰۷۔ نئے عہد نامے کی سوغات	فیاض رفعت	۸۷۷
۱۰۸۔ جلتے پروں سے اڑان	ساجد رشید	۸۸۰
۱۰۹۔ کریم لگا بسکٹ اور چیونٹیاں	مشتاق مومن	۸۸۴
۱۱۰۔ مباہلہ	علی امام نقوی	۸۸۸
۵۔ گمنام کہانی کاروں کا تعارف	ـــــــــــ	۸۹۳

Scanned with CamScanner

ہاجرہ مسرور

منّی — میلے میں

مشعل کا تڑپتا ہوا شعلہ۔ اس پر ڈھول اور ہارمونیم کی آواز ——— وسیع و عریض احاطے کے درختوں پر بسیرا لینے والے کوے چونک کر پھڑپھڑانے لگے۔

چھم چھم ——— اس نے لمحہ بھر کو گھنگھرو بجائے اور بھیرویں گایا۔

ہٹ جا بے دردی گنوار وا، میں تورے سنگ نہ جیہوں ری

بول ختم ہوتے ہی ہر چیز جیسے تلپٹ ہو گئی۔ ڈھولکیا اپنے سر کو جھٹک جھٹک کر اچھل اچھل کر ڈھول پیٹنے لگا۔ ہارمونیم کا پیٹنگ دوڑتی ہوئی اُنگلی کے ساتھ گردن اور آنکھیں نچانے لگا اور مشعلچی بے چارے کی تو شامت آ گئی ——— بول گا کر وہ یوں بجلی کی طرح ان کے دائرے کے اندر چھم چھم کرتی تڑپتی پھری کہ مشعلچی کو اس کے چہرہ روشن کرنے میں خاصی محنت کرنی پڑتی تھی ——— اس بے چارے کو یہ خیال بھی رکھنا تھا کہ کہیں ناچتا ہوا شعلہ ناچنے والی کو جلا نہ دے۔ پھر یہ کم بخت مشعل کیا تھی، اچھی خاصی مصیبت۔ مٹی کے تیل کی بوتل پر بہت سی رسّی لپٹی ہوئی تھی۔ جب مٹی میں آیا ہوا تیل جل جاتا اور شعلہ مدھم پڑتا تو وہ بوتل جھکا کر مٹی کو دوبارہ تیل سے تر کر لیتا۔

منّی بی بی، کمال کی گود میں لدی اس ناچتے تھرکتے شعلے اور اس ناچتی تھرکتی عورت کو جیسے غنودگی میں دیکھ رہی تھی ——— وہ تو سو گئی تھی کہ اچانک کمال اسے گود میں اٹھا کر یہ تماشہ دکھانے لے آیا تھا۔

منّی بی بی کو گہری اندھیری رات میں یہ تھرکتی عورت اور تھرکتی روشنی بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ منّی بی بی کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ دوسرے بہت سے بچوں اور احاطے کے نوکروں کی طرح دائرے میں آگے دوں بیٹھ کر یہ تماشہ دیکھے۔ دوسروں کی طرح وہ بھی پشواز بھری تلے بیٹھنے کی کوشش کرے ——— مگر منّی بی بی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کوشش ناکام ہی ہو گی کیونکہ وہ "ہٹ جا بے دردی گنوا" کہتی چکساتی، چھم چھم کرتی دور چلی جاتی۔ اور ایسی تیزی سے کہ مشعلچی کو دوڑ کر اسے روشنی میں لانا پڑتا۔ اور پھر وہ ہر بار نئے سرے سے جھلملانے لگتی۔ اس کے سر اور سینے پر پڑے گہرے اُودے دوپٹے کا گوٹا اور ستارے، ہری پشواز کا جھونجھ جیسا گھیرا اور سرخ رنگ کا پاجامہ، جیسے بھڑک اٹھے۔ وہ روشنی میں آتے ہی گردن مٹکاتی تو اس کے چاندی کے جھمکے اور چاندی کا جھومر اور سونے تک جیسے پینگ لیتے ڈھیلی ڈھیلی آستینوں میں ڈھکے ہوئے ہاتھ "بے دردی" کو ہٹانے اٹھتے تو چاندی کے گھنگھرو والی چوڑیاں سے کود کر آستینوں میں چھپ جاتیں۔

منّی بی بی کمال کے دیئے ہوئے پیسے اس عورت کی طرف بڑھا بڑھا کر تھک گئی ——— وہ ہر بار پیسے لینے لپکتی، منّی کی بلائیں لیتی اور بے دردی کے سنگ نہ جانے کا جواز پیش کرتی۔

Scanned with CamScanner

میں تورے سنگ جیبا تو بھو کن مر جیبا

مورے پیہر کی جلیبیاں میں تورے سنگ نہ جیباری

اور منّی بی بی کو غنودگی میں یہ تماشہ اتنا اچھا لگا کہ وہ اچانک بڑی فراخ دل ہوگئی۔ اسے اپنی بہنوں پر رحم آنے لگا جو اس کھڑکی کمال کو نوچ نوچ کر اپنے ہاتھ سے ناچنے والی کو پیسہ دینے کی ضد کر رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ میں آیا ہوا پیسہ اپنی ایک بہن کو دے دیا تاکہ اس کی حسرت بھی پوری ہو جائے۔ پھر وہ رات کے اندھیرے میں چُپ چاپ کھڑے ہوئے درختوں کو دیکھنے لگی جن پر مدھم سی روشنی پڑ رہی تھی۔ اس نے ماما بی کی بتائی ہوئی بھتنیوں کو دیکھنا چاہا۔ مگر اسے خلاف معمول آج درختوں پر کچھ نظر نہ آیا۔ ہاں بس اسے شعل کی تھرکتی ہوئی روشنی میں یہ درخت اور بھی اونچے نظر آئے۔ اتنے اونچے جیسے اس کی پھننگیں آسمان میں پیوست ہوگئی ہوں۔ پھر اس نے کمال کے کندھے پر ڈال دیا" اور کمال اور مہاراج کی تیز تیز باتیں سُنیں لیکن گہری نیند نے اسے کچھ سمجھنے کی مہلت نہ دی۔

مگر جب ابا میاں دوسرے دن شہر سے لوٹے تو مہاراج موٹے نے پہلے ہی ان سے کمال کی شکایت جڑ دی ——— اور ابا میاں گھر میں گھستے ہی کمال پر خوب برسے۔ کمال نوکر ہوتے ہوئے بھی نوکر نہ تھا۔ وہ تو منّی بی بی کے گھر بچپن سے پلا تھا اور اب ہسپتال سے سرکاری تنخواہ پانے کے باوجود ابا میاں سے بہت ڈرتا تھا۔

"ابے، ہماری عدم موجودگی میں طائفے بلاتا ہے، اور گھر کی بیبیوں اور بچّوں کو یہ تماشے دکھاتا ہے؟ کم از کم دو دو روپے پڑتے آتی ہوگی کم بخت یوں حرام میں اپنے پیسے اڑاتا ہے" ابا میاں کمال کا کان پکڑے چلاتے رہے۔

امّی نے لاکھ لاکھ ابا میاں کو یقین دلایا کہ انھوں نے احاطے کی کسی بھی بیگم نے ناچ نہیں دیکھا۔ بس دروازے کی دراز سے ایک نظر ڈالی تھی ——— کسی کو اچھا ہی نہ لگا۔ ہم سب تو بیٹھ کر باتیں کرتے رہے تھے۔ اس کے باوجود کمال کے تھپڑ پڑے۔ لیکن کمال یہی کہے گیا کہ اس نے تو یہ طائفہ بلایا ہی نہیں تھا۔ مہاراج نے بلایا ہوگا۔ اب نام اس کا لگا رہا ہے کیونکہ رات دونوں کا جھگڑا ہوگیا تھا۔

منّی بی بی صبح کی اس صورت حال سے سخت چکرائیں ——— ادھر کمال کی ہمدردی کے مارے اُنھیں رونا آیا جاتا تھا۔ آخر ابا میاں نے بطور سزا کمال پر چوبیس گھنٹے کا کرفیو لگا دیا۔ اُنہوں نے کہا جب تک اس کم بخت کی شادی نہ ہو جائے یہ ہسپتال سے سیدھا ڈیوڑھی میں آئے گا اور کہیں باہر نہیں جائے گا۔

منّی بی بی کمال کا تمتماتا منھ دیکھ نہ سکی اس لیے باہر نکل گئی۔ باہر اس کی بہنیں اور دوسرے بچے جمع تھے ——— ان سب نے مل کر منّی بی بی کو بتایا کہ رات کو جس نے جس نے ناچنے والی کو اپنے ہاتھ سے پیسے دیئے وہ سب پیسے اللہ میاں کے گھر آگ میں تپا کر اس کے جسم پر چپکائے جائیں گے۔

"بھئی ہم نے تو ایک ہی پیسہ دیا تھا ——— اللہ توبہ اللہ توبہ" ——— منّی بی بی کی بہن نے ذرا اطمینان سے حساب جوڑا۔ مگر سب سے زیادہ پریشان منّی بی بی ہوئی۔ اس کے دل سے کمال کے پٹنے کا رنج، کمال کے خلاف غم و غصے میں تبدیل ہوگیا ——— "بڑے چالاک! خود تو اللہ میاں کے گھر جلیں گے نہیں۔ ہمیں جلوانے کا انتظام کر دیا" ——— پھر اسے اپنی بے وقوفی پر اتنا پچھتاوا ہوا جس کی حد نہیں۔ لکھنؤ والی پھوپھی اسے پہلے ہی بتا چکی تھیں کہ گانا، ناچنا کودنا گناہ ہوتا ہے۔ بچوں کو چاہیے کہ چپکے سے بیٹھ کر پڑھیں یا اچھے اچھے کھیل کھیلیں۔

ذرا دیر بعد منّی بی بی اپنی امی کا میلا دوپٹہ گھسیٹتی کمال کی کوٹھری میں پہنچی۔

"ہمیں نماز پڑھا دو کمال" وہ منھ پھیر کر کمال سے گویا مجبوراً مخاطب ہوئی۔

Scanned with CamScanner

"کیوں ——— یہ کوئی وقت ہے؟" کمال پلنگ پر لیٹے لیٹے غرّایا۔

"تب کہتے ہیں گناہ ہوگیا ہے اللہ میاں کے یہاں۔" منّی بی بی کا گلا بھر آیا۔

"کیسا گناہ۔" کمال پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"پیسے جو دلوائے تھے تو نے اس عورت کو۔" اور منّی بی بی ایک دم رونے لگی۔

"اچھا! توبہ، توبہ! اب نہیں دوں گا پیسے ———" کمال نے ہنس کر اسے اپنے قریب گھسیٹ لیا۔

"ہمیں اللہ میاں کے گھر جلایا جائے گا؟" منّی بی بی نے سسکتے ہوئے پوچھا۔

"نہ میری بٹیا کو اللہ میاں تھوڑی جلائیں گے، میں کہوں گا مجھے جلا دیجیے، بس۔"

اور منّی بی بی نے آنسو پونچھ لیے ——— کیونکہ اسے معلوم تھا کہ کمال لاکھ جھوٹا سہی مگر منّی بی بی سے کیے ہوئے وعدے ضرور پورا کرتا ہے۔

تب بدلتے موسم میں منّی بی بی بیمار ہو گئی۔ ڈیڑھ ہفتے کے بخار میں وہ اتنی چڑچڑی اور ضدی ہو گئی کہ کمال تک کا کہنا نہ مانتی بلکہ وہ تو کمال کو دیکھ کر اور زیادہ بگڑ جاتی بس ماما بی سے ان دنوں اس کی ذرا ذرا بنی رہی۔ وہ ماما بی سے پوچھتی کہ اللہ میاں کی شکل کیسی ہے، وہ کہاں رہتے ہیں ——— وہ بچوں کو پیار کرتے ہیں یا نہیں؟ اور ماما بی کے پاس تو ہر بات کا جواب موجود تھا ہی ———

بخار اترنے کے بعد بھی وہ ویسی ہی چڑچڑی بنی رہی۔ سب سے الگ تھلگ وہ اپنی پلنگڑی پر جیسے دھونی رمائے بیٹھی رہتی۔ ہاں امی قریب سے گزرتیں تو اس کا جی چاہتا کہ وہ اس کے پاس بیٹھی رہیں۔ لیکن ان بے چاری کو اپنے اتنے بہت سے کاموں سے فرصت ہی کہاں تھی۔

ایک دن کمال منّی بی بی کی بے رخی کے باوجود اس کے قریب آ بیٹھا۔ "کل میلا ہے منّی بی بی ———" کمال نے چپکے سے اسے بتایا منّی بی بی منہ سجائے اپنے سوکھے سوکھے ہاتھ پاؤں سمیٹے بیٹھی رہی۔

"ہم تم کو میلہ دکھانے لے چلتے، مگر ———" کمال نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا اور اپنی بڑی بڑی مونچھیں مروڑنے لگا۔ مگر منّی بی بی ویسے ہی فقیروں کی طرح بیٹھی پلکیں پیٹتی رہی۔

"تم بے چاری نے تو میلہ دیکھا ہی نہیں ہوگا۔" کمال نے جیسے حقارت سے کہا۔

"ہونہہ، ابا میاں نہیں لے گئے تھے؟" ——— منّی بی بی کو گذشتہ سال کی بات یاد آئی۔

"ہونہہ، تانگے پر بیٹھے بیٹھے کہیں میلہ گھوما جاتا ہے! ابا میاں نے تمہیں کہیں تانگے سے اترنے دیا تھا؟" کمال نے پوچھا۔

"نہیں تو ——— اچھے بچے تانگے میں بیٹھ کر میلہ دیکھتے ہیں ابا میاں کہتے تھے ———" منّی بی بی آہستہ آہستہ کمال سے بے تکلف ہونے لگیں۔

"ہائے ہائے میلے کے اندر ایسی ایسی مزے کی چیزیں ہوتی ہیں۔ آدھی لومڑی، آدھی عورت ——— ستار والے، سانپ اور نیولے کا تماشہ اور جناب کھلونے ہی کھلونے۔" کمال نے آنکھیں بند کر کے چیزیں گنوانا شروع کیں۔

"ہنڈولے میں تو ہم بیٹھے تھے ———" منّی بی بی نے اچانک یاد کیا۔

"اور جناب نٹ کا تماشہ ——— اور چاٹ کی دوکانیں، ملائی کی برف اور مرمرے اور بیسن کی پٹّی ———"

منّی بی بی ایک دم مچل گئی ——— بیماری میں اسے اتنا پرہیز کرایا گیا تھا کہ وہ ندیدی ہو گئی تھی۔

Scanned with CamScanner

اس موقع پر کمال اور منّی بی بی کے درمیان ٹوٹا ہوا رشتہ پھر استوار ہو گیا۔ چپکے سے وعدہ ہوا اور منّی بی بی کی بہنوں کو خبر بھی نہ ہوئی کہ وہ جو بیٹھی خلا میں گھورتی رہتی ہے، اندر سے اتنی چالاک بھی ہو سکتی ہے ——— منّی بی بی کے خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور اس نے اپنی بہنوں کو دیکھا جو بلّی اور گڑیا کا بیاہ رچانے میں جٹی ہوئی تھیں ——— اور بلّی پتّیوں کا سہرا جھٹک کر بار بار گھروندے سے بھاگ جاتی۔

اس رات منّی بی بی نے خواب ہی خواب دیکھے۔ کھلونوں کی دکانیں ہی دکانیں۔ مٹّی کی مورتیاں، کپڑے کی گڑیا اور سیلولائڈ کے بھوے ——— پھر جناب مٹّی کی پوری ننھی سی گرہستی ——— چکّی چولھا، ہنڈیا اور گھڑے، صراحی، بیلن، پٹڑا ——— مزے سے گڑیا کو جہیز میں دیا جا سکتا تھا۔ یہ چیزیں کمہارن بھاگ گھر میں لاتی، لیکن امّی اس کی صورت دیکھتے ہی جل جاتیں۔ کیونکہ وہ ہر کھلونے کا آبا مانگتی۔ چاہے وہ سر پر دودھ کا گھڑا اٹھانے والی گجریا ہو یا سر پر کپڑوں کی گٹھری اٹھانے والی دھوبن، حتیٰ کہ کمر پر مشک لادے بھشتی اور سر پر ٹوپ پہنے صاحب بہادر کی بھی وہی قیمت! اس پر بے تحاشہ کا سیر آٹا اور آدھ سیر گڑ الگ مانگتی ——— امّی لینے کو تو یہ مورتیاں لے دیتیں مگر گھنٹوں جھلاتیں کہ خواہ مخواہ پیسے کی بربادی۔ ذرا میں ٹوٹ کر مٹّی میں مل جائیں گی۔ مگر منّی بی بی اپنے حصّے کی گجریا لے کر سوچتی کہ بھلا اتنی پیاری گجریا بھی ٹوٹ سکتی ہے۔ لیکن اسے کیا کیا جاتا کہ گجریا پانے کی خوشی میں دوڑتے بھاگتے ہوئے وہ گرتی اور گجریا ایک ہی دن میں کھیل کھیل ہو کر پکے صحن میں بکھر جاتی اور ساتھ اس کی ساری مسرت بھی ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتی ——— پھر اللہ کرتا کہ بی بسا طن، آئینے، کنگھی، مسّی سرمہ، اور جانے کن کن الابلا کے ساتھ دروازے پر پھریرا لگاتی تو منّی بی بی فوراً اسے اندر آنے کی دعوت دے دیتی کیونکہ بی بسا طن کی ٹین کی صندوقچی میں گڑیاں بھی تو ہوتیں ——— منّی بی بی گڑیا کے لیے مچلتی تو امّی کہتیں "اے ہے کمبخت، یہ گندی سندی روئی بھری گڑیاں بھی تمہارے کھیلنے کی چیز ہیں؟ تم اپنے بھوے سے کھیلو" ——— مگر منّی بی بی کو یہ سیلولائیڈ کے سخت سخت بھوے نہ بھاتے، اسے تو رنگ رنگ کے کپڑوں میں ملبوس، انگل انگل بھر نمک پاروں کی طرح بڑی آنکھوں والی گڑیاں ہی اچھی لگتیں ——— یہ گڑیاں اسے کبھی نہ ملیں، وہاں وعدے ملتے کہ کل وہ اپنی امّی سے کپڑے کی گڑیا لا دلا کر بہلا لے ——— لیکن یہ وعدے کبھی پورے نہ ہوتے۔ مگر اس منّی بی بی کے خوابوں پر تو نئے فیشن کے جاپانی کھلونوں کا اور امی کا بس نہ تھا

منّی بی بی نے رات بھر سوتے میں اتنی بہت سی کپڑے کی گڑیاں خریدیں کہ اس سے اٹھائے نہ اٹھیں ——— اور پھر خوابوں میں ابّا میاں کا زور بھی نہ چلا، جراثیم کی پروا کیے بغیر مزے سے وہ بھر بھر چاٹ اور ملائی کی برف کھاتی رہی۔ مگر آخر خواب میں ابّا کی سواری کا سفید جھاگ جیسے غلافوں والا تانگہ آ ہی گیا، جس میں اس کی بہنیں فراکیں پہنے غرور سے بیٹھی میلہ دیکھنے چلی آئی تھیں ——— چمکتی ہوئی صبح میں منّی بی بی کی آنکھ کھلی تو بڑی مشکل سے اسے یقین آیا کہ وہ خواب دیکھ رہی تھی ——— یہ صبح دسہرے کے میلے کی صبح تھی۔

منّی بی بی خوابوں اور تصورات کے بوجھ سے لدی پھندی، بے حد وقار کے ساتھ اپنی پلنگڑی پر یوں اٹھ کر بیٹھ گئی، جیسے اس کے گھر کو ٹھینگے برابر بھی اہمیت نہ دیتی ہو۔ بیماری کے بعد سے شروع ہونے والے معمول کے مطابق نہ ٹھنکی نہ روئی، اس نے باورچی خانے کے سامنے پڑی ہوئی پھوٹی والی بدصورت میز کے گرد بیٹھی ہوئی اپنی بہنوں کو دیکھا۔ وہ سب کیسی مریھکوں کی طرح چینی کے بڑے بڑے پیالوں پر جھکی، گرما گرم دودھ اور ڈبل روٹی کے ملغوبے میں چمچے چلا کر بیٹ کا دوزخ بھر رہی تھیں اور انھیں خبر بھی نہ تھی کہ منّی بی بی کو اس کم بخت ناشتے کی ذرہ برابر بھی پروا نہ تھی ——— آج سے پہلے وہ بھی اپنی بہنوں کے ساتھ ناشتے کی میز پر آتے ہی یہ سوچ کر کوڑھا کرتی تھی کہ انھیں روز روز دودھ اور ڈبل روٹی کیوں ملتی ہے۔ ایک ابّا میاں ہیں کہ ان کے لیے مامائی کشتی میں چائے دان سجا کر یوں لے جاتیں جیسے بچے نظر لگا دیں گے۔ ارے اگر وہ چائے دان کی ٹوپی نہ بھی اڑھایا کرتیں تو بھی بچے زبردستی تو

ہو خوش بودار سنہری سنہری جلیبیاں نہ پی لیتے ـــ اور پھر دم تلے ہوئے انڈے ـــ حلوے ـــ اور قلفیاں ان کے بھائیوں کو تو ان چیزوں میں حصہ مل جاتا لیکن ان بے چاریوں کی قسمت ... تو صرف جاڑوں کی بارش میں کھلتی جب ان کے دودھ بھرے پیالوں میں چلو بھر چائے یہ سوچ کر ڈال دی جاتی کہ ذرا گرم ہو جائیں ـــ اور انڈے؟ انڈے تو جب سے پھوپھی آئی تھیں لڑکیوں کے لیے ممنوع تھے۔ ابا کو خبر کیے بغیر پھوپھی نے فیصلہ کروا لیا تھا کہ لڑکی ذات کو گرم چیز زیادہ کھلانا مناسب نہیں ورنہ تو اس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے جوان بچیاں ہو جائیں گی ـــ مگر ہزار بار انڈے کو چھو کر دیکھا اسے ٹھنڈا ہی لگا ـــ اور پھر اسے انڈے کی پوری ایک بھی جب انڈے کھلائے جاتے کچے پکے فرائی پین سے اتار کر سامنے ڈال دیے جاتے۔ جنھیں کھاتے ہوئے سب بہنوں کو ابکائیاں آتیں۔

ماما جی کشتی سجا کر ابا میاں کے کمرے کی طرف گئیں مگر منی بی بی نے ادھر دیکھا بھی نہیں تھا کہ ان حقیر باتوں کی پروا کب تھی بغیر کسی کے کہے پلنگڑی سے اتری، لوٹے کے بچے ہوئے پانی کے چند قطروں سے ایک ہی ہاتھ پھیر کر پانا تھا، ناک اور ٹھوڑی پھیر کر پھر اپنی پلنگڑی پر براجمان ہو گئی۔

"منی بی بی ادھر دکھاؤ، پورا منہ دھویا یا آدھا۔" منی بی بی کی سب سے بڑی بہن نے روز کی طرح اس کی چوری پکڑنا چاہی۔ جانے کیوں منی بی بی کو گندا ثابت کر کے بہت خوشی ہوتی۔

"دھو لیا ـــ پونچھ بھی لیا ہے۔" منی بی بی نے بڑے رکھ رکھاؤ سے جواب دیا۔

"ہٹ گندی۔ ہمیں خوب معلوم ہے کہ تو نے کلی بھی نہیں کی ہوگی اور فراک میں منہ پونچھا ہوگا۔" بڑی بہن نے کہا۔

"اور آ کر یہ کھاؤ نا۔ میٹھا کیا ہو۔ کیا تمھیں چائے ملے گی؟" دوسری بہن نے اس کے حصے کے بھرے پیالے کی طرف اشارہ کیا۔

منی بی بی کا جی چاہا کہہ دے۔ "تمھی کھاؤ ہم آج ـــ" مگر کمال نے تو اسے منع کیا تھا کہ کسی سے میلے جانے کی بات نہ کرنا ورنہ سب پیچھے لگ جائیں گی۔ اس لیے منی بی بی اٹھی اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر چمچ چمچ دودھ نگلنے لگی۔

اس صورت حال سے مطمئن ہو کر اس کی بہنیں میز پر سے خوش خوش اٹھ گئیں اور بھاگ کر پچھلے احاطے میں بھاگ لیں۔ ماسٹر صاحب نے چھٹی کی تھی۔ اس لیے وہ اطمینان سے گھنٹوں کھیل سکتی تھیں ـــ کبھی پرانی اینٹوں کا گھر بنتا اور کبھی درختوں کے پتوں کا باغ لگتا ـــ اردگرد کے ایک جیسے ایک قطار میں بنے ہوئے چھ گھروں کا ایک مشترکہ احاطہ تھا، سب گھروں کے بچے چھٹی کے دن یہاں آزادی سے کھیل سکتے تھے۔

منی بی بی بہنوں کو جاتے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ باہر کمال اپنی کوٹھریا میں ان سب کے انتظار میں بیٹھا ہوگا۔ انھیں دیکھتے ہی کہے گا کہ آخری گھر والی بھوسانی نے انھیں بلایا ہے۔ اور وہ سب بھورانی کے گھر کی طرف بھاگ جائیں گی جہاں خالہ بھورانی اپنی آنگن میں آنے والے ہر بچے کو کاغذ کے پھول بنا بنا کر دیتیں اور ان کے ہاں لڈو تو ہمیشہ مٹکے میں بھرے رہتے گھی کے خوب بڑے بڑے لڈو ـــ بچے گھنٹوں ان کی آنگن سے نہ نکل پاتے۔

اپنی بہنوں کے بے وقوف بننے کے تصور میں وہ ایسا کھوئی کہ پیالے میں دودھ ختم ہو گیا۔ ابا میاں کے تانگے میں سائیس گھوڑا جوت دیا ہوگا ـــ منی بی بی نے تصور کیا۔ وہ گھوڑے کے ٹاپیں سن رہی تھی۔ مگر اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابا میاں جلدی چلے جائیں گے اور وہ چپکے سے کمال کے ساتھ تمام دن میلے میں گھومے گی۔

پر ہوا یہ کہ ابا میاں امی کو خدا حافظ کہہ کر باہر چلے گئے اور پھر تانگہ گزرنے کی آواز بھی اس نے سن لی۔ پھر منی بی بی نے اطمینان

کی سانس لیتے ہی دوسری فکر اپنے سر پر لادلی —— جانے اس کی بہنیں بہورانی کے گھر گئیں بھی یا نہیں؟

پھر کمال خوشی سے کھِلا اندر آ گیا —— ایسا ٹھاٹ کئے ہوئے تھا کہ لگتا آج عید ہے۔ خوب گھیر کی شلوار، بوسکی کی قمیص، گلے میں سرخ رومال اور سر پر یہ گز دو گز لمبی پگڑی، جسے اس نے بڑے بانکپن سے ایسا پیچ در پیچ باندھا تھا کہ اس کا بایاں کان تک ڈھک گیا تھا۔ امّی نے کتاب پر سے سر اٹھا کر دیکھا اور مسکرائیں۔

دیکھیے، باجی اب صاحب اگر ماریں بھی تو میرے کان پر چوٹ نہیں لگ سکتی —— " کمال نے اپنے پگڑی کی طرف اشارہ کیا۔

"دیکھا! توبہ۔ بڑا بے غیرت۔ کہے دیتی ہوں شام سے پہلے چلے آنا ورنہ پٹو گے ——" امّی نے سنجیدہ بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیا، میں نہیں جاتا۔ مُنّی بی بی کی وجہ سے میں نے کہا چلا جاؤں۔ بے چاری مُنّی بی بی اتنی بیمار رہی ہیں۔" کمال نے احسان اٹھا امی کے سر رکھ دیا۔

ہاں تم تو بے چارے بالکل شوقین نہیں —— خیر جلدی سے لوٹ آنا ——" امی نے کہا۔

اور کمال نے امّی کو کوئی جواب دیے بغیر مُنّی بی بی کو لال رنگ کی فراک پہنائی اور پھر اچھا سا چوڑی دار پاجامہ جو عید پر پہننے جانے کے بعد اب ذرا سا چھوٹا ہو گیا تھا —— بڑی مشکلوں سے ایڑیوں چڑھا۔ اور کوئی دن ہوتا تو منی بی بی اپنا پیر موڑنے پر خاصا چیختی، چلاتی، مگر آج قریب بیٹھی وظیفہ پڑھتی پھوپھی نے اس کی ہسی، تک نہ سُنی۔

پھر کمال، منی بی بی کو اپنی کوٹھریا میں لے جانے لگا تو ماما بی نے اسے للکار کر دوسرے بچوں سے بے انصافی کا احساس دلانا چاہا لیکن کمال نے ادھر توجہ بھی نہ دی —— ایک دم نجانے کیوں اپنی بہنوں کے لیے مُنّی بی بی کا جی پگھل گیا۔

کمال نے اپنا بکس کھول کر وہ ٹوپی مُنّی بی بی کے سر پر جما دی جس پر خوب ڈٹ کر ستارے اور گوٹا ٹپا ہوا تھا اور اوپر رنگین پر کی کلغی لگی تھی —— یہ وہ ٹوپی تھی جو کمال نے منی بی بی کے لیے اس کی سال گرہ پر خاص اپنے پیسوں سے خریدی تھی اور جسے امّی نے یہ کہہ کر کمال کے بکس میں واپس رکھوا دیا تھا کہ جب تمہارے بچے ہوں تو انھیں پہنانا۔

دھوپ کی ترچھی کرنوں میں بڑے مزے کی آنچ تھی۔ مُنّی بی بی نے کمال کے کندھے پر بیٹھے بیٹھے ہر طرف بڑی آسودگی اور مسرت سے دیکھا۔ درختوں سے چڑیاں اُترتیں اور نیلے آسمان تلے پر پھیلا کر، چھوٹی چھوٹی اڑانیں کر کے، زمین پر اترتیں، اور پھر زمین پر چونچیں مار کر دوبارہ اُڑ جاتیں۔ پتھر کٹی مٹیالی کھردری سڑک پر کمال کے جوتوں کی نعلیں بج رہی تھیں۔ منی بی بی آنکھیں بند کر لیتی تو گھوڑے کی سواری کا پورا لطف اٹھا لیتی۔ لیکن وہ آنکھیں کیسے بند کرتی۔ وہ تو دھوپ میں آنکھیں مچمچا کر دور سے نظر آنے والے تو سروں کے راستوں کو دیکھنے کی فکر میں تھی۔

دور سے میلے کا شور مُنّی بی بی کے کانوں تک پہنچتے پہنچتے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ بن گیا تھا۔

ریلوے اسٹیشن سے ڈاکیہ آج کی ڈاک کا تھیلا لادے آ رہا تھا۔ اس نے مُنّی بی بی کو اس نے مُنّی بی بی کو اس میلے میں پہچان لیا۔ "کہاں چلی مُنّی بی بی؟" ڈاکیے نے رک کر پوچھا۔

"میلے جا رہے ہیں —— " مُنّی بی بی نے اس طرح روہانسی ہو کر کہا جیسے سسرال جا رہی ہوں دراصل مُنّی بی بی کا جی چاہ رہا تھا کہ اس کی بہنیں اس کے ساتھ ہوتیں اور اسے اس شان سے میلے جاتے دیکھتیں تو کتنا مزہ آتا۔ اتنے میں بچے نے کمال کا کندھا اور

Scanned with CamScanner

اس پر مُنّی بی بی کی سواری ——— !

مُنّی بی بی نے کمال کے ماتھے تک آئے ہوئے تیل کی خوشبو محسوس کی اور اپنا منہ پیچھے کی طرف پھیر لیا۔ اس کی باہیں کمال کی پیچ در پیچ بندھی ہوئی پگڑی پر لپٹی ہوئی تھیں۔

میلے کی بھنبھناہٹ اب بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ بھوگنی پور کی طرف سے پگڑیوں اور دھوتیوں والے مرد اور لہنگوں والی عورتوں سے ٹھس ٹھس بھرے ہوئے اکّے آتے اور نا ہموار سڑک پر کھڑاک کھڑاک کرتے قریب سے گزر جاتے۔ عورتوں اور بچّوں سے لدی ہوئی بیل گاڑی "چوں چاں" کرتی رینگ رہی تھی اور ان میں بیٹھی ہوئی عورتیں میلے جانے کی خوشی میں گھونگھٹوں کے اندر ایک دوسری سے آواز ملا کر جانے کیا گا رہی تھیں کہ ان کی آوازیں بیل گاڑی کی چوں چاں میں گھل مل گئی تھیں ——— مُنّی بی بی منہ پیچھے کیے بیل گاڑی کا تماشہ دیکھ دیکھ کر تھک گئی۔ وہ کمال سے کہنا چاہتی تھی کہ جلدی جلدی چلو، مگر گھر سے نکل کر کمال نہ جانے کس موڈ میں تھا کہ گم سُم دھیرے دھیرے چلا جا رہا تھا۔ کندھے پر بیٹھے بیٹھے مُنّی بی بی کا جسم تھک چکا تھا۔

اب میلہ پیچھ رہا تھا۔ وہ ہنڈولے کے چرخ چوں اور عورتوں اور بچّوں کی مسرّت سے بھری چیخیں سن رہی تھی۔ ہری، لال اور پیلی اوڑھنیاں ہنڈولے کے چکّروں میں جھنڈوں کی طرح لہرا رہی تھیں۔ ناریل کے حُقّے اُٹھائے ہنستے بولتے لوگوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے مُنّی بی بی نے یہ سب دیکھا۔ اور پھر کاغذ اور گتے سے بنے ہوئے اونچے کالے راون کو دیکھا، جس کے مُنہ کو دیکھنے کے لیے مُنّی بی بی کو اپنا سر اتنا اٹھانا پڑا کہ گردن دُکھ گئی۔

کھلونوں اور چاٹ کے ٹھیلے اور عارضی دکانیں اس انبوہ میں جیسے دب گئی تھیں۔ مُنّی بی بی کو یہ اتنے بہت سے لوگ یوں لگے جیسے کمہار کے ٹوکرے میں بھرے کھلونوں میں جان پڑ گئی ہو ——— اور ان کھلونوں کے کسی گھیرے میں بندر ناچ رہا تھا۔ کہیں سانپ والا بین بجا رہا تھا۔ ایک طرف ٹھاٹ خیمہ لگا تھا جس کے باہر ایک شخص منہ رنگے لومڑی کے دھڑ والی عورت دیکھنے کی دعوت دے رہا تھا۔ قدم قدم پر مُنّی بی بی رک جانا چاہتی تھی۔ مگر وہ تو کمال کے قدموں پر چل رہی تھی اور کمال کم بخت اپنے سارے وعدے بھول کر مجمع سے راستہ بناتا آگے ہی آگے بڑھتا جاتا تھا۔

مارے غصّے کے مُنّی بی بی کا گلا بھر آیا اور آنکھوں میں دو آنسو ٹھہر سے گئے، اور ان آنسوؤں کے پار سے اس نے پیچھے چھوڑی ہوئی ان ساری چیزوں کو دیکھنا چاہا تو اسے کمال کی مونچھیں راون کے فالتو سروں کی طرح دور تک پھیلی اور اکڑی ہوئی لگیں۔

تب کمال ایک کچی دیوار میں جڑے ہوئے پرانے دروازے کے سامنے رک گیا۔

"مُنّی بی بی بھوک لگی ہے؟" ——— کمال نے اسے کندھے سے اتار کر نیچے کھڑا کرتے ہوئے پوچھا۔

مُنّی بی بی نے مارے غصّے کے جیسے ڈھائی من کا سر نفی میں ہلایا۔ وہ چاہتی تھی کہ کمال اس کے غصّے کو سمجھ لے۔ لیکن کمال پر کوئی اثر نہ ہوا۔

جب اندر سے کواڑ کی کنڈی کھلی تو وہ گوبر سے لپے پُتے آنگن میں تھے۔

باہر میلہ چیخ رہا تھا۔ لیکن یہاں ڈربے کے قریب کھڑی مرغی کی "کٹ کٹ" صاف سُنی جا سکتی تھی، جو روئی کے گالوں جیسے چوزوں کے سامنے چوگے دانے اُٹھا اُٹھا کر ڈال رہی تھی اور کھونٹے سے بندھی ہوئی بکری جھونسی پر منہ مارتے ہوئے کس زور کی سانسیں لے رہی تھی کہ جھونسی اڑ اڑ جاتی ——— اور جس عورت نے دروازے کی کنڈی کھولی تھی، کیسی بے تکلف تھی کہ اُس نے غصّے سے بندوق کی طرح بھری مُنّی بی بی کو ایک دم گود میں اُٹھا لیا۔

اور وہ ہنس ہنس کر کمال سے کہہ رہی تھی: "ہم کہیں جھوٹ بولت ہو کہ بٹیا کو بھی ہمرے سنگ لیہو ——" اور وہ منّی بی بی کو کولھے پر ایسی آہستگی سے اٹھا کر چلی جیسے منّی بی بی نہ ہو کانچ کی چوڑیوں کا توکرا ہو —— اور وہ عورت بڑی بے بسی سے کھڑی رہ گئی۔

"کا ہوا؟ کاہے رووت ہیں بٹیا۔ کا ہم تم کا کچھ تکلیف دیاہیں ہیں؟" وہ اپنا بھرا بھرا منہ حیرت سے کھول کر پوچھنے لگی۔

"میلہ دیکھنے کو رو رہی ہیں ——" کمال نے اسے اپنی گود میں لیتے ہوئے جھلّا کر کہا —— کمال کی اس بے رخی پر شاید منّی بی بی زور سے روتی —— لیکن ——

"اسے تو کاہے پہلے ہمرے سنگوا لے آتیو۔ میلہ دکھائیو پہلے ——" عورت بھی منّی بی بی کی طرح کمال سے روٹھ گئی۔

"ہم نے کہا پہلے کھیر کھلا دیں ——" کمال نے ہنستے ہوئے کہا اور عورت کا آنچل تھام لیا۔ لیکن وہ اپنا آنچل چھڑا کر چھن چھن اپنی جھانجھیں بجاتی ڈبے کی طرف بھاگی اور ایک چونّہ مٹھی میں دبا لائی —— چونّہ ہاتھ میں لیتے ہی منّی بی بی کی ریں ریں تھم گئی۔

اب منّی بی بی نے عورت کی گوبر کی گول گول تھاپیوں سے سجی ہوئی دیوار کے پس منظر میں غور سے دیکھا۔ جہاں وہ بکری کے برتن میں پانی ڈال رہی تھی۔ منّی بی بی کے گھر کی ماں کی طرح اس نے بھی چوڑی دار پاجامہ اور کرتہ پہن رکھا تھا —— ننگے پاؤں جن پر جھانجھیں بج رہی تھیں اور ہاتھوں میں گھنگھریاں لگی چوڑیاں، ناک پر کیل، خوب کسی ہوئی لال موباف والی چوٹی اور آنکھوں میں پھیلا ہوا کاجل —— منّی بی بی نے چونّے کو اپنی فراک کے دامن میں چھپا کر اس عورت کو پہچاننے کی کوشش کی اور جب وہ چھن چھن کرتی کمال کے قریب آئی تو کمال کے منع کرنے کے باوجود اس نے کھاٹ پر اطمینان سے بیٹھی ہوئی منّی بی بی کو دوبارہ کولھے پر لاد لیا۔

اور اس وقت منّی بی بی کو ماما بی کے کپڑوں والی عورت کے جسم سے امّی کے جسم جیسی خوشبو آئی۔ وہ خوشبو جو اتنے بہت سے بہن بھائیوں کے ہنگامے میں اسے دور ہی دور سے تڑپاتی تھی۔

وہ تینوں ذرا دیر بعد ایک ہی پلنگ پر چھپر تلے یوں سر جوڑے بیٹھے تھے جیسے ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔

منّی بی بی نے صاف ستھرے ٹھنڈے چولھے تلے اوپر رکھی ہوئی مٹی کی ہانڈیوں کو دیکھا۔ چھینکے پر رکھے ہوئے امرودوں اور کوٹھری کے دروازے والے کنڈے میں لٹکے ہوئے طوطے کے پنجرے کو دیکھا جس کے اندر طوطا مزے سے ٹیں ٹیں کر کے امرود کتر رہا تھا۔ اس سارے ماحول میں منّی بی بی نے میلے کی آوازیں سننے کی کوشش کی لیکن اس وقت وہ کم بخت عورت ہانڈی سے کٹورا بھر کھیر نکال لائی اور منّی بی بی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کھائے کیسے؟ آخر کمال کے کہنے پر وہ یوں کوٹھری کے اندر بھاگی جیسے اس سے بڑی خطا ہو گئی ہو۔ منٹ بھر میں وہ تام چینی کا چھوٹا سا چمچ لے آئی اور اسے اپنے ہاتھ سے چمچہ بھر بھر کھیر کھلانے لگی۔ منّی بی بی خوب اترا اترا کر کھاتی رہیں اور قریب لیٹا ہوا کمال ایڑیاں رگڑ کر بار بار کھیر کے لیے اپنا منہ کھول کھول دیتا لیکن عورت نے چمچہ بھر کھیر اسے نہ دینا تھی نہ دی —— ہاں وہ بار بار کمال کو اس طرح منہ بنا کر گھورتی جیسے امّی مہمانوں کے سامنے منّی بی بی کو بدتمیزی سے منع کرنے کو گھورتی تھیں —— کمال کی یہ گت دیکھ کر منّی بی بی کو ہنسی آ گئی۔

پیٹ بھرنے کے بعد شاید منّی بی بی پھر میلے کے بارے میں سوچتی لیکن وہ عورت اتنی مہلت ہی نہ دیتی۔ بار بار صدقے قربان ہو کر کبھی وہ منّی بی بی کی پرانے فیشن کی ٹوپی پر لوٹ جاتی اور کبھی منّی بی بی کی صورت پر۔ منّی بی بی مارے غرور کے پھولی جا رہی تھی۔

منّی بی بی مرغی کے بچے سے کھیل کھیل کر تھک گئی تو پھر ضدیں شروع کر دیں۔ عورت کے ہاتھ کی چوڑیاں اتروا کر اپنے پاؤں میں پہنیں اور پھر چھم چھم کرتی سارے گھر میں دوڑتی پھری۔ گوبر کی تھاپیاں دیوار سے اکھاڑ پھینکیں۔ بکری کو لکڑی سے مار مار کر پھر گڑیا کے لیے مچل گئی۔ ان دونوں کا کھانا حرام کر دیا۔

کمال نے [illegible]

آجاتا۔ یا وہ عورت صبر کر جاتی تو اتنی دیر میں منّی بی بی مر نہ جاتی۔ مگر وہ تو کھانا چھوڑ کوٹھری میں گھس گئی۔ کھونٹیوں پر سے گٹھریاں اُتار اُتار کر وہ گڑیا بنانے کا سامان جمع کرنے لگی۔ منّی بی بی نیم تاریک کوٹھری میں کھڑی اس کے پلو سے کھیلتی رہی جیسے وہ ڈھونڈتی ہو کہ عورت کہیں اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔

گڑیا کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ منٹوں میں بن جاتی۔ تکیہ کھول کر روئی نکالی گئی۔ پرانا پاجامہ پھاڑ کر کپڑا بیونتا گیا۔ گڑیا کے انتظار میں منّی بی بی کی آنکھیں غنودگی سے بھاری ہو گئیں۔ پھر اس نے اپنی بند ہوتی آنکھوں کے سامنے کمال کو عورت کا ہاتھ کھینچتے دیکھا۔

"شرم ناہیں آوت ہے۔" وہ بگڑ کر چلائی۔

"ہے تیری ——— بڑی شرم والی آئی ہے ———" کمال پھنکارا اور پھر منّی بی بی نے غنودگی کو جھٹک کر دیکھا۔ عورت کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ گڑیا چپ چاپ سی رہی تھی۔ اور کمال۔ کمال کا چہرہ منّی بی بی کو اتنا بُرا لگا۔ اتنا بُرا کہ وہ ڈر کر عورت کے گھٹنے پہ اوندھ گئی۔

پھر منّی بی بی نے ایک دیہاتی لوری سُنی اور عورت کی گود میں پسر کر سو گئی۔

جب منّی بی بی، عورت کی گود میں کُنمنا کر جاگی تو عورت نے سب سے پہلے اس کے ہاتھ میں گڑیا پکڑا دی۔ گڑیا کے ماتھے پر ستارے کی بندیاں اور دوپٹے تلے ماؤں جیسا بھرپور سینہ تھا اور جسم پر گوٹے ستارے سے بھری پیشواز۔!

کمال گھر میں نہیں تھا ——— باہر میلہ چیخ رہا تھا مگر منّی بی بی کو دونوں میں سے ایک کا بھی خیال نہیں آیا۔ مزے سے گڑیا لیے عورت کے پیچھے پیچھے سارے گھر میں پھرتی رہی۔ عورت نے گھر میں جھاڑو لگائی۔ بکری کی مینگنیاں سمیٹ کر کنارے جمع کیں۔ مرغی کو اس کے چوزوں کے ساتھ ٹاپے تلے بند کیا۔ طوطے کو امرود دیا اور پھر منّی بی بی کا منہ ہاتھ دُھلا کر، سر میں خوب تیل چپڑ کر چوٹی بنا دی اور پھر آنکھوں میں کاجل لگا کر ماتھے پہ اُنگلی دھیمے سے چھوا دی۔

"نظر نہ لگے ———" اس نے چٹ چٹ منّی بی بی کی بلائیں لیں اور خود منہ ہاتھ دھو کر کنگھی کرنے بیٹھ گئی۔

تب کمال آگیا ——— منہ تمتمائے ———

"گڑیا کا جوڑ لائے رے؟" عورت نے سر پر دوپٹہ ڈال کر ذرا بے رخی سے کمال سے پوچھا۔ اور کمال نے ماتنگے کے زیور کا آنے والا پتہ اس کے سامنے پھینک دیا۔ اور وہ پلنگ کی پٹی میں اڑسی ہوئی سوئی لے کر گڑیا کے ماتھے پر چپکا، اور کانوں میں بندے ٹانکنے لگی۔ پھر اس نے گڑیا کے گلے میں ماتنگے کا ننھا سا طوق اور ٹکلیوں والا ہار پہنایا۔ ہاتھوں میں ماتنگے کے کڑے اور پاؤں میں جھانجھیں۔

"چلو منّی بی بی دیر ہو رہی ہے ———" کمال نے ایک دم بے صبر ہو کر منّی بی بی کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔

"نہیں ———" منّی بی بی نے جواب دیا۔

"ذرا دم لیو، گڑیا تیار ہے ———" وہ جیسے چوٹ کھا کر تڑپی۔

"میلے میں بہت گڑیاں مل جاتی ہیں" کمال نے پھر منّی بی بی کو گھسیٹا۔ لیکن منّی بی بی گڑیا ہاتھ میں لے لینے کے باوجود، باہر نہیں جانا چاہتی تھی۔

"تم بھی چلو ———" منّی بی بی نے عورت کا پلو نہ چھوڑا، اور وہ اپنا سر ڈھکتی اس کے ساتھ ساتھ دروازے تک آئی۔

"چلو ہم تمہرے پیچھے آوت ہیں ———" وہ آہستہ سے بولی۔

Scanned with CamScanner

کمال نے منّی بی بی کو کندھے پر بٹھانے کے لیے ہاتھوں میں اُٹھایا تو وہ ٹھٹھک گیا۔

"تو نے کاجل لگا دیا منّی بی بی کو؟ اور یہ کالا ٹیکا ماتھے پر؟" وہ چیخ کر بولا اور اپنے رومال سے ماتھے اور آنکھوں کا کاجل پونچھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن منّی بی بی قابو میں نہ آئیں۔

عورت کچھ نہ بولی۔ پھر وہ دروازے میں کھڑی رہی۔ منّی بی بی نے گردن موڑ موڑ کے اسے دیکھا ——— پھر وہ دروازے سے نکل کر پیچھے پیچھے بھاگتی آئی اور کمال رُک گیا۔

"لے یہ اپنا روپیہ ———" عورت نے روپیہ کمال کے سامنے پھینک دیا اور واپس چلی گئی اور منّی بی بی کا کلیجہ کھینچ کر اس کے ساتھ چلا گیا۔

اتنے بڑے میلے میں منّی بی بی کو تنہائی کا گہرا احساس ہوا۔ وہ منہ لٹکائے میلے سے گزرتی گئی۔

سورج چھپنے لگا تو لوٹ دس سروں والے راون کو آگ لگ گئی ——— راون کے پیٹ میں بھرے ہوئے پٹاخے شدّت سے چھٹنے لگے۔ منّی بی بی کو ڈر لگا۔ پھر رام، سیتا اور لکشمن کے جلوس کو دیکھ کر وہ ڈر کم ہو گیا۔ لیکن کمال خدا جانے اسے کیوں اجنبی سا لگ رہا تھا۔

کمال نے منّی بی بی کو سارے میلے میں پھرایا۔ چاٹ کی دوکان مرمرے والے کا خوانچہ اور ملائی کی برف والے کے پاس بھی لے گیا۔ گیس کے ہنڈوں اور دو شاخے چراغوں اور لالٹینوں کی روشنی میں دکانیں چمک رہی تھیں۔ کھلونوں پر بچّوں کا ہجوم تھا۔ اس کے باوجود منّی بی بی، کمال کے کندھے پر گُم سُم سی بیٹھی رہی۔ کمال اس سے بار بار پوچھتا۔ یہ لوگی؟ وہ لوگی؟ لیکن منّی بی بی تو بالکل سادھو ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود کمال نے بساطی کی دُوکان سے کاجل کی ننھی سی ڈبیا خرید لی۔

"دیکھو منّی بی بی کسی کو بتانا نہیں کہ کاجل کس نے لگایا تھا۔ کہنا کمال نے لگایا تھا"

کمال نے اسے ہدایت کی۔

"اچھا"

"اور دیکھو کہنا گُڑیا کمال نے دُکان سے خریدی تھی ———"

"اچھا" منّی بی بی نے بے دھیانی سے کہا۔ کیوں کہ وہ تو کمال کے کندھے پر بیٹھی، میلے کے بیچ میں، لوگوں کے ایک دائرے میں ایک عورت کو دیکھ رہی تھی، جس کے پیچھے ڈھولکیا اور ہارمونیم والا سر تال درست کر رہے تھے ——— اور مشعلچی، ڈوپٹے کا پلو ٹھیک کرتی ہوئی اس عورت کے آگے بوتل پر ناچتے ہوئے شعلے کو لہرا رہا تھا ——— شعلے کی روشنی میں پوڈر سے سفید کیے ہوئے چہرے والی عورت بار بار اپنا ڈوپٹہ ٹھیک کر رہی تھی۔ ڈوپٹہ ——— جس کے ایک آنچل پر ترلچکا گوٹا موجود تھا مگر دوسرے آنچل پر غائب۔

منّی بی بی کو یاد آیا۔ ایک رات غنودگی کے عالم میں اس نے اپنے گھر کے دروازے پر اسے ناچتے دیکھا تھا اور پیسے دیئے تھے۔

"کمال ——— کمال ——— وہ! ——— وہ عورت ———" منّی بی بی نے خوف زدہ ہو کر کمال کو ادھر متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن کمال میلے سے باہر آ رہا تھا۔

راستے میں کمال کی پگڑی سے لپٹے لپٹے منّی بی بی نے بہت سی ہدایتیں سُنیں۔ وہ دھیرے سے اچھا کہتی پھر اُن جانے دکھ میں کھو جاتی ——— میلہ آہستہ آہستہ دور ہو گیا۔ اور منّی بی بی کا دل وہیں کہیں میلے میں کھو گیا۔ اسے اپنا مرغی کا جوڑا یاد آنے لگا ——— اور وہ عورت جس پر وہ ایک دن کے لیے حاکم بن گئی تھی۔

رات کو گھر پہنچ کر کمال نے منّی بی بی کو کندھے سے اُتارا تو ابا میاں جھپٹ کر کمرے سے نکلے اور آتے ہی کمال کے سامنے پہنچے

"کہاں رہا دن بھر ——— ؟"

"میلے میں صاحب ———"

حرام زادے میں نے خود تجھے اس رنڈی کے گھر سے نکلتے دیکھا ——— "ابا میاں دھاڑے ۔ اور پھر کمال کے منہ پر اُلٹے سیدھے کئی تھپڑ برس پڑے ۔ پگڑی کھل گئی ۔ اور کمال سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ دبا میاں اندر چلے گئے ۔۔۔۔۔۔

منّی بی بی گڑیا دبوچے ، سہمی ہوئی اپنی امی کے قریب چلی گئی - لیکن کمال کو یوں پٹتے دیکھ کر منّی بی بی کا دل اس کے لیے حقارت آمیز رحم سے کچھ ہو گیا۔

"یہ گڑیا ——— پھر دلا دی اس کم بخت نے ! جانے کیسی گندی روئی بھری ہو گی ———"

امی نے چلا کر کہا۔ اور منّی بی بی نے گڑیا لے کر آسمان پر اُڑ جانا چاہا۔

"چھی چھی ——— گندی چیز ——— !" امی نے گڑیا اس کے ہاتھ سے چھین لی - پھر انھوں نے لالٹین کی روشنی میں گڑیا کو غور سے دیکھا۔

"یہ کس نے دی ہے تم کو ؟" امی نے ذرا مسکرا کر پوچھا۔

منّی بی بی نے تکیے کی روئی کا حوالہ دیتے ہوئے سچ بات کہہ دی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اب اتنی صاف ستھری خوب صورت گڑیا امی اسے واپس کر دیں گی۔

"اسے ہے ذرا دیکھنا یہ گڑیا بنائی ہے یا پوری عورت ——— توبہ ! یہ خراب عورتیں بچوں تک کو اپنے بمشکلوں سے خراب کرتی ہیں"
——— امی بڑبڑائیں۔ گڑیا کا دوپٹہ الٹ کر دوبارہ اس کا ماؤں جیسا اُبھرا ہوا سینہ دیکھا اور گڑیا ماما بی کی طرف اچھال دی۔

"لو اسے چولہے میں ڈال دو"

اور ماما بی نے گڑیا بڑے غصے سے چولہے میں جھونک دی - پھر جو وہ اپنا بھاری بھر کم جسم ہلاتی لوٹیں تو منّی بی بی ڈری کہ کہیں ماما بی اسے بھی چولہے میں جھونکنے تو نہیں آ رہی ہیں۔

"خراب عورت ——— خراب عورت !!" منّی بی بی کے سمجھ میں نہیں آیا کہ خراب عورت کون تھی ——— !

اور پھر منّی بی بی اُمچھ کر اتنا روئی ، اتنا چیخی کہ ابا میاں کو کمرے سے دوبارہ نکل کر اس پر تھپڑ برسانے پڑے۔

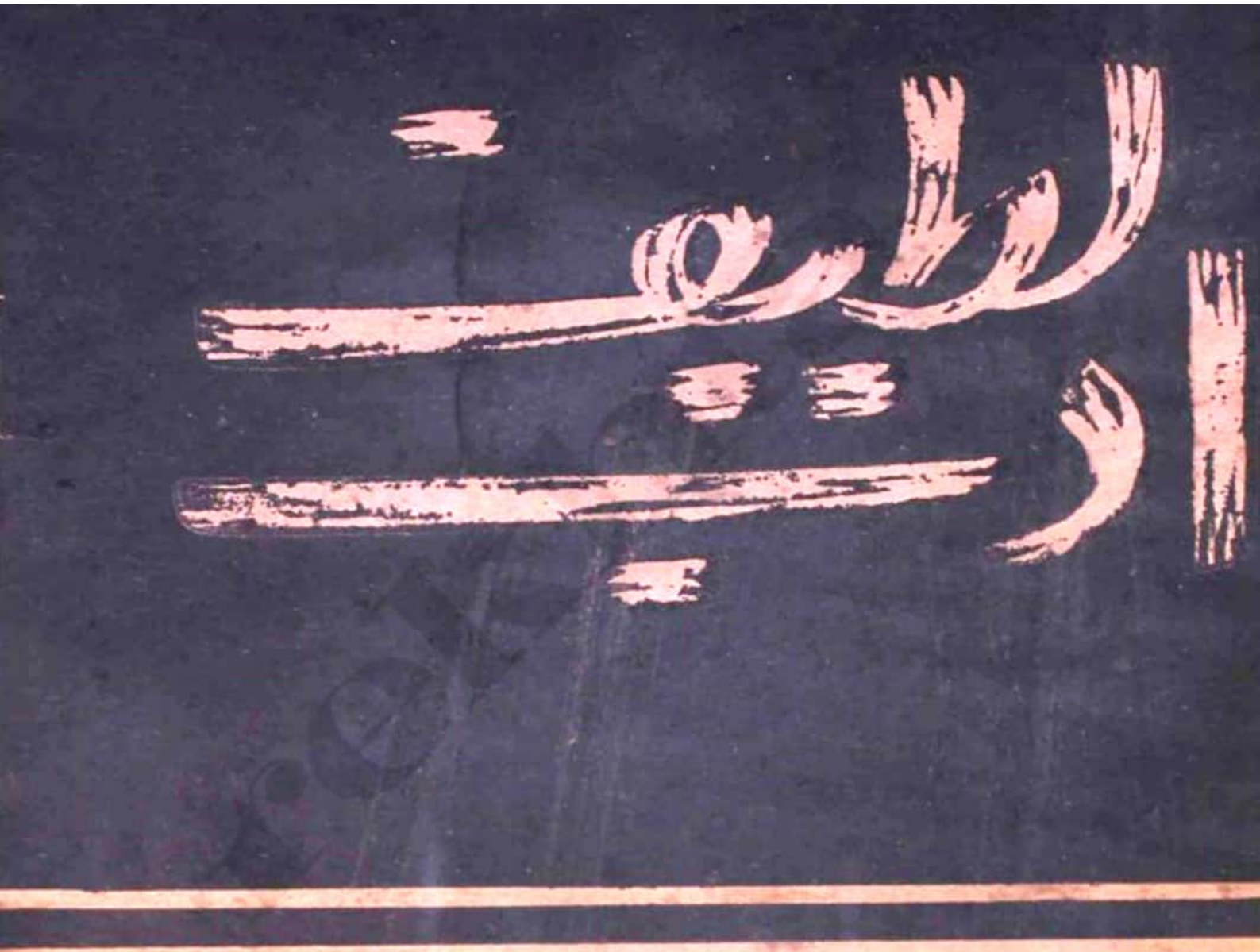

ادب لطیف

۱۹۴۵

سالنامہ

مکتبہ اردو لاہور

Scanned with CamScanner

سالنامہ
۱۹۴۵ء

ادبِ لطیف

ایڈیٹرز:
احمد ندیم قاسمی
چوہدری نذیر احمد
چوہدری برکت علی

مکتبہ اُردو لاہور

قیمت سالنامہ
۲ روپے

زرِ سالانہ
۶

Scanned with CamScanner

فہرس

جلد ۷ مارچ، اپریل ۱۹۴۵ء شمارہ ۲،۱

مقالے :-

معروضات	کرشن چندر	۹
حالی — ایک انسان	قاضی عبدالغفار	۲۱
ترقی پسند ادب	مسعود زاہدی	۲۶
تنقید نگاری	عبادت بریلوی	۳۵
اردو کا جنم	فراق گورکھپوری	۴۶
کہتے ہیں جس کو عشق	کنہیا لال کپور	۵۱

نظمیں :-

پہلی کرن	ن، م راشد	۵۳
پس و پیش	اختر الایمان	۵۵
عالم کہتے	جاں نثار اختر	۵۶
منزل تک	معین احسن جذبی	۵۷
حسنِ سوگوار	علی سردار جعفری	۵۸
زاویئے	مجید امجد	۵۹
اس کا عشق	مخمور جالندھری	۶۰
دھندلکا	سلام مچھلی شہری	۶۱
پیمانِ وفا	آوا بدایونی	۶۲
غزل	حفیظ ہوشیار پوری	۶۳
سنجوگ	میرا جی	۶۴
غزلیں	شکیل بدایونی	۶۵
پھر بھی	فکر تونسوی	۶۶
خودکشی سے پہلے	ساحر لدھیانوی	۶۷
معاصرے	احمد ندیم قاسمی	۶۸
ہرچہ بادا باد	راجیشوری	۶۹
افکار	حامد عزیز مدنی	[illegible]

افسانے :-

داستان گو	قاضی عبدالغفار	[illegible]
ناپختہ	کرشن چندر	[illegible]
بیڑیاں	عصمت چغتائی	۷۷
دیوان خانہ	اختر حسین رائے پوری	۸۱
نئے دھان سے پہلے	دیویندر ستیارتھی	۸۶
پل	ممتاز مفتی	۹۴
آگے اور پیچھے	مہندر ناتھ	۱۰۰
ایں دفتر بے معنی	قرۃ العین حیدر	۱۰۸
سیمنٹ	اختر اورینوی	۱۱۵
اکیلی	احمد ندیم قاسمی	۱۲۳
ترا گرا	ابوالفضل صدیقی	۱۳۰
چڑھاؤ اتار	خواجہ احمد عباس	۱۴۰
نیلم	سعادت حسن منٹو	۱۵۳
کوٹھی اور کوٹھڑی	ہاجرہ مسرور	۱۶۴

مرکنٹائل پریس میں باہتمام چوہدری برکت علی پرنٹر پبلشر چھپ کر دفتر رسالہ ادب لطیف لاہور سے شائع ہوا۔

Scanned with CamScanner

ہاجرہ مسرور

کوٹھی اور کوٹھڑی

چھنن چھنن ــــــ جن خانساماں کباب تل رہا تھا۔ خالص گھی کی خوشبو میں ملی جلی کبابوں کی سنہری کش خوشبو سے ننھو بیرے کی معمولی بھوک ایسی طاقتور ہو گئی کہ پورے پیٹ میں گڑبڑ مچا دی۔ اس نے خالی کشتی زمین پر رکھ دی اور اپنے پپیے پپیے نتھنے پھڑکاتا، منہ میں بھیجتے ہوئے پانی کے گھونٹ حلق سے اتارتا بید کے مونڈھے پر سکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کی حریص نظریں انگاروں پر رکھی ہوئی کڑاہی پر اس طرح جم گئیں جیسے کبھی ہٹنے کا نام نہ لیں گی ــــــ کڑھائی سے سرخ سرخ کبابوں کا ہلکا چٹپٹا دھواں نکل رہا تھا۔ اور ننھو کی خالی آنتیں بری طرح اینٹھ رہی تھیں۔ صبح سے اس نے ایک باسی روٹی کے سوا کچھ بھی نہ کھایا تھا۔ اور اب رات بھی فاقے سے گزرنے کی نوبت تھی ــــــ مہینے کے آخر دنوں میں اکثر اسے فاقے کی آڑ بھگت کرنا پڑتی۔ بیس روپیہ خشک پر ملازم، یہ رقم اس مہنگائی کے زمانے میں کسی طرح پوری ہی نہ پڑتی۔ پہلے تو خیر کسی نہ کسی طرح گزارا ہو بھی جاتا تھا۔ لیکن اس نے شادی کیا کی دل کے سکھ کے لئے پیٹ کا دکھ ہو گیا۔ ــــ اس کی نئی نویلی دلہن ہزار طرح کے نخرے کرتی پوروا نہ پڑنے پر۔ اس کا باپ ایک بڑے گھرانے کا باورچی تھا۔ اس لئے بیٹی نے بھی زبان کا مزا خوب خوب اٹھایا تھا چوری کے کھانوں سے اور اب جو پلے بندھی ننھو کے۔ تو یہاں وہ بات کہاں! بس اس لئے بات بات پر منہ پھیلاتی۔ اپنی قسمت کو کوستی اور مارے نخروں کے ننھو کا ناک میں دم رکھتی ــــــ شروع شروع میں تو ننھو جانے کہاں کہاں سے ادھار مانگ کر اس کو منا لیتا۔ لیکن آخر کب تک کوئی قرض دئے جاتا۔ ایک کا بھی تو ادا نہ کرتا ننھو ــــــ بس مہینے کے آخر دنوں ضرور دو تین وقت کا فاقہ پڑ جاتا۔ اور ننھو تھا کہ رونی صورت بنائے پھرتا ــــــ چھوٹے سے دل اور دماغ کا آدمی تھا۔ اس لئے فاقے کو اپنی اور اپنی عورت کی تندرستی کے لئے زہر سمجھتا تھا۔ ورنہ اس کی میم صاحب تو گھر میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مہینے میں دو دن فاقہ کرنا ضروری خیال کرتی۔ صرف اس لئے کہ فاقہ صحت کے لئے مفید ہوتا ہے۔ لیکن ننھو تو چھوٹا آدمی تھا۔ اس لئے ان بڑی بڑی باتوں کو کیا خاک سمجھتا! بس اس کا تو جی یہی چاہ رہا تھا کہ مونڈھے پر سے اچک کر چھنن چھنن کرتی ہوئی کڑھائی میں ہاتھ ڈال دے اور جلتے ہوئے کباب ایک دم نگل جائے۔ لیکن جمن خانساماں جو بیٹھا تھا ہاتھ میں کفگیر لئے اپنی سیاہ گھنی مونچھوں پر خوفناک تاؤ دئے۔ کمبخت کی مونچھیں ایسی نکیلی اور ناک کی طرف مڑی ہوئی تھیں، جیسے دو بڑے بڑے سیاہ بچھو اپنے ڈنک اٹھائے بیٹھے ہوں۔ اور اس کی بیچاری ناک ان دو سیاہ نوکوں کے درمیان بڑی مظلوم سی دکھائی دیتی۔ جمن میم صاحب کا چہیتا اور منہ چڑھا نوکر تھا۔ اس لئے کوٹھی کے سب ملازموں کو اپنے سامنے اتنا ہی بے بس رکھتا جتنا اپنی ناک کو اپنی مونچھوں کے درمیان وہ جس نوکر سے کسی بھی بات پر جل جاتا اسے نوکری سے الگ کروائے بغیر چین نہ لیتا۔ اور ننھو یہ سب جانتا تھا۔ اسے اپنی یہ نوکری بہت عزیز تھی۔ برسوں مل کی پر شور فضا میں کام کرنے کے بعد اور مہینوں ڈلیا ڈھونے کے تجربہ نے اسے اس نوکری پر جم جانا سکھا دیا تھا۔ ــــــ بس! ننھو کی بھوک اندر ہی اندر اسی طرح گڑبڑ مچائے ہوئے تھی جس طرح گھر کی چار دیواری میں بند کسی بہت ہی جوان لڑکی کے سستے اور گندے جذبات!

بجلی کی سفید روشنی میں سرخ سرخ کباب تیار ہوتے جا رہے تھے۔ اور ننھو اپنی سفید زین کی پتلون پر ہتھیلیاں رگڑ رگڑ کر غٹ غٹ رال کے گھونٹ پیٹ میں اتارتا جا رہا تھا۔

"کیوں بیٹا کیا آنکھوں ہی آنکھوں میں نگل جائے گا کباب؟"

جمن نے زہر میں بجھی بولی بول کر گھی میں تر انگلیوں سے اپنی مونچھوں کو تھپکا۔ اور پھر زور سے ہنس پڑا۔ اسے معلوم تھا کہ اکثر مہینے کے آخر دنوں میں باورچی خانے میں قدم رکھتے ہی ننھو کی آنکھوں میں

حریصانہ چمک کیوں پیدا ہو جاتی ہے۔ اور گردن کی نیلی بڑی بار بار کس لئے حلق کی طرف پڑھتی اترتی رہتی ہے؟

"نہیں بھیا! مرچیں ہوں گی ان میں آنکھیں پھوٹ جائیں گی۔" نتھو نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "آخر مہینہ ہے نا بھیا، چولھا بھی ٹھنڈا پڑا ہے ——— میرا کچھ نہیں، پر تیری بھابی کا خیال ہے ———" نتھو یہ کہتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ شاید جمن کو کچھ رحم آجائے۔ اور وہ تھوڑا سا کھانا یا کچھ پیسے دیدے۔

"میرے یار! یوں کام نہیں چلے گا۔" جمن بولا۔ اور پھر ایک آنکھ ذرا سی دبا کر ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ "بھابی! پتلی کمریا، بالی عمریا ——— ہی ہی ہی"

جمن ہمیشہ نتھو کی عورت کا نام آتے ہی ایک آنکھ میچ کر ہنستا تھا۔ اسے اس کے بھوکے ہونے کی اتنی پروا نہ تھی جتنی کہ اس کی پتلی کمریا اور بالی عمریا کی ——— نتھو کے دماغ میں جیسے کوئی چیز ایک دم جل کر بجھ گئی ——— بھوک پھر مشتعل ہو گئی اور غیرت جاگ اٹھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ جھپٹ کر جمن کی بڑی بڑی مونچھوں کو پکڑ کر جھول جائے۔ اس کی آنکھیں نکال لے اور دانت توڑ ڈالے ——— "بدمعاش نہیں تو! حرام کی روٹیاں کھا کھا کر بہت پھولا ہوا ہے۔ ایک کمائی کرنے والی عورت کے سیدھے منہ بات کر لینے نے دماغ بگاڑ دیا ہے۔ سؤر کا ——— کہتا نہیں تو ———" نتھو کے دماغ میں ہلچل مچ گئی کہ جمن کے ساتھ جانے کیا کچھ نہ کر کے اور کہہ کے، اس کے آنکھ دبا کر ہنسنے کا بدلہ لیا جائے، لیکن وہ مونڈھے پر سے ہل بھی نہ سکا ——— جمن دانت نکالے بڑی بے فکری سے کباب تلے جا رہا تھا ——— چھنن چھنن ———

"صاحب کو شراب کے ساتھ کباب بہت پسند ہیں ——— یار! صاحب کے تو پو بارہ رہتے ہیں ہمیشہ۔ میم صاحب کیا ہیں ٹکسال ہیں کہ کبھی روپے کی کمی ہی نہیں ہوتی۔ صاحب ان کے ہوتے ———" جمن نے نتھو کو دیکھتے ہوئے ذرا رشک سے کہا۔ اور نتھو جو پتھر کے بت کی طرح مونڈھے پر جما ہوا تھا۔ جلدی جلدی پلکیں جھپکانے لگا ——— جمن تلے ہوئے کباب چینی کی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہتا ہی رہا ایسی ہی کوئی سالی عورت مجھے مل جائے تو ایک سال کے اندر اسی کوٹھی کے برابر اس سے اچھی کوٹھی کھڑی کرالوں میں بھی ——— یہ سن کر نتھو کے دماغ میں جیسے کوئی چیز بھک سے جل کر بجھ گئی۔ آخر وہ اتنا بیوقوف تو نہ تھا کہ جمن کا اشارہ نہ سمجھتا ——— اس نے تلملا کر اپنے حساب جمن کے منہ پر جوتا مارنے کو کہا

"ارے بھیا! صاحب بڑے آدمی ہیں۔ ان کی بڑائی ہی ان کی عزت ہے۔ ہم تم غریب لوگ ہیں۔ عزت ہی کو عزت سمجھتے ہیں۔ اور موقع پڑے پر اس کی خاطر خون بہانے سے بھی نہیں چوکتے ———"

"ہی ہی ہی ———" جمن نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے آنکھ دبا دبا کر اسی مخصوص انداز میں ہنسنا شروع کر دیا۔ جس سے نتھو کے سارے جسم میں مرچیں لگ جاتی تھیں ——— "بھوکا ہے یار ——— اس لئے الٹی سیدھی سوجھتا ہے۔ جا بھابی کو ادھر بھیج دیجیو کباب روٹی دے دوں گا ———"

"نہ بھیا! رہنے دے، اللہ کی مرضی اگر اسی میں ہے کہ ایک رات بھوکے سو رہیں تو کیا ہرج ہے ———" نتھو نے اپنے پیٹ کی گڑگڑاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑی رکھائی سے کہا۔ اور جیسے اس کی روح مجسم اٹھی کہ اور ہوا وہ بھی اتنا بلند انسان ہے کہ عزت کے لئے بھوکا رہنا گوارا کر سکتا ہے ——— لیکن ساتھ ہی اسے اپنی جسمانی کمزوری کا شدید احساس ہوا کہ کاش وہ بھی جمن کی طرح خوب موٹا تازہ ہوتا تو مزا چکھا دیتا میاں جمن کو ایسی کچی بات منہ سے نکالنے کا۔ دیکھو جب وہ کم بخت یوں ہی انٹ شنٹ مشورے دیا کرتا نتھو کو ——— جیسے اس بدمعاش کی اماں تھی ہی نہیں ——— وہ اکثر نتھو کی عورت سے بھی بڑھ بڑھ کر مذاق پہ اتر آتا جس کی شکایت کئی بار نتھو سے بھی ہوئی ——— اس کم بخت نے رشتہ بھی تو کتنا اوچھا دار لگا رکھا تھا اس کی عورت سے۔ وہ اسے تاؤ میں آکر ڈانٹ بتانے کی ہمت بھی کرتا۔ تو بات ہنسی مذاق پر اڑ جاتی۔

چھنن چھنن ——— دیوار میں لگی ہوئی برقی گھنٹی بالکل نتھو کے کان کے پاس بجی۔ اور نتھو ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ کبابوں سے

بھری پلیٹ کشتی میں رکھ کر چلنے لگا تو جمن نے پھر اس کی دکھتی ہوئی رگ پکڑ لی۔

"دیکھ یار! راستے میں کھا مت جیو۔" اور ننھو کے جسم میں جیسے آتشبازی کی چھچھوندر چھوٹ گئی۔ وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹتا ہوا باورچیخانے سے باہر نکل گیا۔ اب مارے رنج اور ندامت کے اس کی بھوک مرگئی تھی۔ وہ اسی طرح منہ اٹھائے کھانے کے کمرے تک گیا۔ جیسے اس کے ہاتھوں میں کباب نہیں بلکہ کوئی بہت ہی غلیظ چیز ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جمن اسے سمجھتا کیا ہے؟ وہ غریب ضرور ہے غلیظ ہرگز نہیں جو چوری کرنے لگے یا ایک عورت رکھ کر کوٹھی بنانے کی فکر کرنے لگے ـــ

"ہا ہا ہا ـــ" صاحب ہنس ہنس کر پی رہے تھے۔ اور پی پی کر ہنس رہے تھے۔ ننھو کو دیکھ کر ہنکارے۔ ان کی زبان بری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔

"ابے! ادھر رکھ دے کباب اور مرغا بن کر دکھا مجھے۔ مرغا بن کر ـــ سمجھا کچھ؟ ابی؟ ـــ" صاحب پر شراب اپنا پورا رنگ چڑھا چکی تھی۔ ان کی آنکھیں کچھ چڑھی ہوئی تھیں اور چہرے پہ ورم سا تھا۔ ننھو نے ان کے حکم کو سنا ان سنا کر کے چوری چوری ادھر ادھر دیکھا۔ میم صاحب مع اپنے نئے مہمان کے کمرے سے غائب تھیں۔ اور اس کمرے سے ملحق خوابگاہ کے دروازوں میں لگے ہوئے شیشوں کے اس پار سنسان اندھیرا تھا۔ ننھو نے ایسا برا سا منہ بنا کر پلیٹ میز پر رکھ دی جیسے اس نے کوئی کڑوی چیز نگل لی ہو ـــ حالانکہ وہ تقریباً روزانہ یہی تماشا دیکھتا تھا۔ لیکن آج نہ جانے کیوں وہ اس اندھیرے کو دیکھ کر بجائے سستی سی لذت حاصل کرنے کے کچھ پریشان سا ہو گیا۔

"ابے! تو دیکھتا کیا ہے؟ اے؛ شراب پینا برا ہے؟ ہیں! میری عورت دوسرے کے پاس ہے یہ بھی برا ہے، کیوں؟ ـــ پر جب میری ٹانگ کٹ گئی تھی ریل تلے، تو کیا میری شاندار نوکری کے ساتھ ساتھ پیٹ بھی کٹ گیا تھا میرے جسم سے؛ مجھ سے تو کسی کو ہمدردی نہ ہوئی اور ہوئی تو میری عورت سے ـ خوبصورت اور جوان عورت سے ـــ آہا! یار لوگ مجھ لنگڑے کے سہارے کو چھین لینا چاہتے تھے۔ وہ سب اس سے کہتے کہ تیری زندگی خراب ہو گئی۔ آ ہم تجھے لے چلیں اپنے ساتھ۔ یہ لنگڑا اب تجھے کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ کچھ بھی نہیں ـــ سمجھا؟ وہ میرے یار عورت کی جوانی دو میٹھے بولوں اور دو ٹانگوں کے عوض خریدنا چاہتے تھے ـــ پر یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ اور اب تمام وہی لوگ ایک وقت میں اپنی بھری جیبیں میرے سامنے خالی کر دیتے ہیں ـــ ہاہا ہا ـــ پر مجھے تو بری بری نظروں سے نہ دیکھ۔ مجھے کوئی بھی برا نہ کہے ـــ میں نے وہی کیا جو میرے نہ چاہنے کے باوجود بھی ہوتا ـــ" صاحب نے نشے میں جھوم جھوم کر بکواس جو شروع کی تو سلسلہ دیر تک ختم نہ ہوا ـــ وہ ہر رات کو زیادہ پی جانے کے بعد اپنے سسکتے ہوئے ضمیر کی دبی دبی کراہ کو اس طرح گھونٹنے لگتے شرابی ویسے ہی نشے میں بہت زیادہ صاف گو ہو جاتا ہے۔ لیکن صاحب تو اپنی پوری زندگی کو بالکل ہی ننگا کر دیتے ـــ دن میں وہ کتنے سنجیدہ بلکہ کس قدر خوفناک سے نظر آتے تھے۔ اچھے اچھے لوگوں کی زبانیں لڑکھڑا جاتیں ان سے بات کرتے ہوئے ـــ اور نوکروں کی تو مجال نہ تھی دم مارنے کی ان کے سامنے؛ فضلو مالی جو نوکروں کے بیچ میں چرس کا دم لگانے کے بعد صاحب کو گالیاں تک دینے سے نہ چوکتا تھا۔ ان کی ایک آواز پر کانپ جاتا اور ننھو بیچارہ تو ویسے ہی مخنی اور دبلو سا آدمی تھا۔ دنیا کی سختیاں جھیلے ہوئے اس قدر بے آرام وہ نوکری کو دانتوں سے پکڑے رہتا۔ پھر بھلا وہ کیوں نہ صاحب سے ہر وقت رعب کھاتا؛ خواہ صاحب نشے میں دھت کیوں نہ ہوں۔ مارے ڈر کے آنکھ نہ اٹھاتا۔ تو اس وقت بھی وہ بت بنا کھڑا تھا۔ صاحب کی بکواس جواب بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے میں تبدیل ہو چکی تھی اور بھی اس کے پاؤں پکڑے ہوئے تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں صاحب اسی حالت میں گر گرا نہ پڑیں۔ اسی طرح وہ ایک بار یوں ہی روتے روتے میز پر اوندھے گئے تھے۔ اور گلاسوں کے ٹوٹ کر چبھ جانے سے ان کی پیشانی سے خون نکلنے لگا تھا

اور میم صاحب ان کا خون دیکھ کر پاگل سی ہو گئی تھیں۔ انہوں نے بید چکا چکا کر سارا الزام بیچارے نتھو پر ہی رکھ دیا کہ تو کہاں چلا گیا تھا؛ انہیں اتنا مدہوش چھوڑ کر؛ میم صاحب کا تو نتھو کو یہ حکم تھا کہ میری عدم موجودگی میں صاحب کے پاس اس وقت تک رہو جب تک کہ وہ اپنے بستر پر نہ چلے جائیں — بس! یہ مجبوری تھی نتھو کے لئے، ورنہ وہ تو کب کا سٹک جاتا باہر کی طرف۔ اس کا جی الجھ رہا تھا۔ اور سر میں دھیمی دھیمی گھمری سمائی ہوئی تھی۔ کباب میز پر پڑے پڑے ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ اور نتھو کی بھوک آہستہ آہستہ گرم ہوتی جا رہی تھی۔ دماغ میں خیالات کی عجیب گڈمڈ تھی — جن کے زہر میں بجھے ہوئے کچوکے، صاحب کی ہچکیاں، میم صاحب کے بید کی چمک، شراب کی بو، بیکار پڑے ہوئے کباب اور اس کی بھوک — نتھو پر ایسی جھنجلاہٹ سوار ہوئی کہ اگر اس کا بس چلتا تو صاحب کا گلا دبا دیتا — میز پر پڑے ہوئے کباب اور صاحب کی جیب میں ٹھنسی ہوئی نوٹوں کی گڈی جھپٹ کر باہر بھاگ جاتا — اپنی عورت کی بانہہ پکڑتا اور پھر کہیں بہت دور نکل جاتا جہاں یہ نوکری نہ ہوتی اور نہ یہ مجبوری۔ لیکن اندھیرے کمرے میں میم صاحب کی چوڑیاں کھنک رہی تھیں۔ اور نتھو بہت ڈرتا تھا ان کی چوڑیوں بھری سفید سفید کلائیوں سے —

رات کو کہیں بارہ بجے کے بعد وہ اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر کوٹھی سے نکلا اور سفید پتھریلی سیڑھیوں کو اپنے کانپتے ہوئے پیروں سے ہولے ہولے ٹھٹکتا اترا۔ اور پھر اپنا سر جھکائے کوٹھی کے پچھواڑے بنی ہوئی نوکروں چاکروں کی کوٹھریوں کی طرف چل دیا — شروع مہینے کا ٹوٹا سا چاند، سڑک کنارے خاموش کھڑے ہوئے درختوں کی آڑ سے سہمی سہمی روشنی اس کی راہ میں بچھا رہا تھا۔ موسم خزاں کی جھپٹ میں آئے ہوئے کتنے ہی سوکھے پتے اس کے قدموں تلے آ کر کھڑکھڑاتے، چرمراتے لیکن وہ کسی سحرزدہ شخص کی طرح بے خبر سا چلتا ہوا اپنی کوٹھری کے نزدیک پہنچ گیا — کواڑ انگلی سے ٹھیلے تو وہ کھل گئے اور نتھو نڈھال سا کوٹھری میں داخل ہو گیا۔

کوٹھری کی گرم اور امسی ہوئی فضا میں طاق پر رکھا ہوا چراغ بدبودار دھواں اگل رہا تھا۔ اور نتھو کی عورت چارپائی پر بے سدھ سی پڑی سو رہی تھی — پپڑائے ہوئے ہونٹ، کچھ کھلے کھلے سے، بھری بھری پنڈلیوں پر سے دھوتی ذرا سرکی ہوئی۔ اور بالوں کی کچھ نھنی لٹیں ماتھے پر سوئی ہوئی — نتھو نے ایک تھکی ہوئی سی نظر اس پر ڈالی اور پھر اپنا کوٹ اتار کر کھونٹی پر ٹانگنے لگا۔ کوٹ ٹانگتے ہوئے اس نے مارے نقاہت کے اپنے ہاتھ میں تیز لرزش محسوس کی تو اس کی آنکھیں بے اختیار آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ رگوں میں بھوک کی تیز سنسناہٹ زناٹے بھرنے لگی۔ اور وہ مردہ سا ہو کر زمین پر پڑ گیا۔ اسے یہ احساس بری طرح ستانے لگا کہ وہ بھی کتنا مجبور ہے جو بھوکا ہونے کے باوجود سامنے پڑا ہوا بیکار کھانا نہیں کھا سکتا۔

چراغ کی لو دھواں اگلے جا رہی تھی۔ بدبودار سیاہ دھواں۔ اور نتھو اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چراغ پر گاڑے ہوئے تھا۔ اس کا جسم اسی طرح بے حس و حرکت تھا۔ جیسے وہ مر گیا ہو۔ بھوک کی شدت سے پیٹ میں ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ تیز گھرچن محسوس ہو رہی تھی۔ اور اس کے گڈمڈ خیالات کا پرشور بہاؤ موڑ پر آ گیا تھا۔ بڑے ہی خطرناک موڑ پر — اس موڑ پر جس کے خیال ہی سے وہ ذرا دیر پہلے جن کی مونچھوں میں جھول جانے کی سوچ رہا تھا — لیکن بھوک کا نشہ، صاحب کی پی ہوئی شراب کے نشے سے کہیں زیادہ مدہوش کن تھا۔ نتھو بہک بہک کر سوچ رہا تھا کہ آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ اگر اپنے جسم کا کپڑا ذرا دیر کو کسی دوسرے نے بھی پہن لیا — معاوضے میں اپنے دام بھی کھرے ہو گئے اور کپڑا تو پھر اپنا ہی ہے — میل کچیل کی کہو تو روپے کی آب ایسی کہ میل کچیل پر نظر بھی نہیں پہنچتی دنیا والوں کی — صاحب بھی تو ہیں، ایک ٹانگ گھٹنے تک غائب۔ بالکل سوکھے سہمے سے۔ لیکن سبھی ان کے سامنے پہنچ کر رعب کھاتے ہیں — سب آنے جانے والے میم صاحب سے زیادہ انہیں کے ناز اٹھاتے ہیں۔ اور سنا ہے کہ کوٹھی سے

Scanned with CamScanner

باہر بھی ان کی خاصی عزت ہے۔ بڑے بڑے کاموں میں انہیں ضرور دعوت دی جاتی ہے۔ ہماری طرح کالا ہوتے ہوئے بھی صاحب کہلاتے ہیں۔ اور ان کی عورت میم صاحب —— اور میم صاحب بھی تو بہت چاہتی ہیں صاحب کو۔ غرض سچ کہتا ہے جمن کہ صاحب کے تو پو بارہ رہتے ہیں —— میرے پاس بھی سب کچھ ہو جائے گا۔ تو لوگ مجھے بھی صاحب کہا کریں گے۔ اور میری جبریا کو میم صاحب، آہا! پھر دیکھوں گا اس سالی دنیا کو جس نے ہمیشہ مجھے ٹھوکر ماری —— اور ہاں وہ جمن کم بخت۔ چند روٹیوں اور کبابوں کے لئے میری عورت کو بلاتا ہے —— ایسا ہی تو جو کھا ہے —— بدمعاش نہیں تو۔ یہ تو اگر ایک لاکھ روپیہ بھی دے گا تو اسے صورت نہ دیکھنے دوں گا اپنی عورت کی ——

ننھو کے جسم میں ذرا جان آنے لگی۔ اس نے حقارت سے منہ بنایا اور غرور سے گردن گھما کر چارپائی پر بے سدھ پڑی ہوئی عورت کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے اس کے ہاتھ میں ساری دنیا کی باگ ڈور ہے۔ چراغ کی زرد اور مدھم روشنی میں سوئی ہوئی نوخیز عورت کا حسن جاگ رہا تھا۔ ننھو کی آنکھوں میں مسرت کی کرنیں جنم لینے لگیں کہ آہا کتنی خوبصورت ہے اس کی عورت اور اس کی قیمت جمن لگاتا ہے چند روٹیاں اور کباب! کیسا الو ہے جمن بھی! ننھو جی ہی جی میں مسکرایا۔ اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے میم صاحب آگئیں۔ مٹاپے کی طرف مائل جسم گوری رنگت بڑی لیکن گول آنکھیں۔ قدرے چپٹی ناک اور موٹے موٹے ہونٹ۔ ایسے ہونٹ جو سرخی چھٹنے کے بعد جونکوں کی مانند دکھائی پڑتے۔ خون چوس کر پھولی ہوئی کالی کالی جونکیں —— کچھ زیادہ اچھی نہ تھیں وہ۔ اس پر بھی وہ سو روپیہ سے کم پر کسی سے بات کرنا بھی گوارا نہ کرتیں۔ بس ان کے دم سے کوٹھی میں دولت کی ریل پیل تھی —— ان کے مقابلے میں اس کی عورت کتنی خوبصورت اور کس قدر نازک تھی۔ تو کیا وہ محل بنوا دینے سے قاصر رہ سکتی تھی؟

ننھو کے جی پر مسرت کا گدگدا سا بوجھ لمحہ بہ لمحہ بھاری ہونے لگا۔ اور اس کی کھلی ہوئی آنکھوں کے سامنے چراغ کی کپکپاتی ہوئی لو نے بڑے سے برقی قمقمے کا روپ دھار لیا۔ اور اس کی نیم تاریک کوٹھری بڑی سی شاندار سجی سجائی کوٹھی میں تبدیل ہو گئی —— کوٹھری کے ایک کونے میں بنا ہوا چولہا جس میں ٹھنڈی راکھ اٹی پڑی تھی ایک دم گرم ہو گیا۔ اور ایک جمن جیسا باورچی گرم گرم سرخ کباب چھپا چھپ اتارنے لگا —— آہا!

ننھو کے جسم میں جانے کہاں سے طاقت بھر گئی۔ اور وہ اٹھ کر اپنی عورت کی چارپائی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ وہ اب تک بے خبر سو رہی تھی۔ وہی کھلے کھلے ہونٹ۔ بکھری لٹیں۔ اور ننگی پنڈلیاں۔ جیسے وہ تکان سے چور چور ہو کر آرام کی نیند سوئی ہو۔ ننھو ہولے سے اس پر جھک گیا اور اس طرح ہولے ہولے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا جس طرح کپڑے کی کسی دکان پر کوئی دیہاتی ریشمی کپڑے کے تھانوں کو چھوتا ہے۔ بہت پیار سے، بالکل دھیرے دھیرے کہ کہیں کوئی شکن نہ پڑ جائے کہیں میلا نہ ہو جائے۔ اس وقت سے پہلے اس کی عورت کا جسم اس کے لئے میلے ہاتھ پونچھنے کی تولیہ سے بھی بدتر تھا۔ مگر اب! اب تو وہی جسم اس کے لئے سب کچھ تھا۔ ننھو کا جی چاہا کہ وہ اسے جگا کر اپنی جنت کی راہ بتا دے۔ لیکن پھر یہ سوچ کر اس کے قریب سے ہٹ آیا کہ کہیں وہ بھڑک نہ جائے سن کر۔ جب اس راہ پر قدم رکھ دیگی تو پھر آپ ہی آپ عیش و آرام کی جگمگاتی ہوئی دنیا کی طرف لپکنے لگے گی۔

ننھو نے اپنے فیصلے سے مطمئن ہو کر ایک انگڑائی لی۔ ایک دم کئی کٹورے پانی پیا۔ اور طاق میں سے بیڑی کا وہ ٹکڑا اٹھا کر سلگایا جو وہ صبح بے خیالی میں طاق پر پھینک گیا تھا۔

رات کا خوفناک ناگ تیزی سے رینگ رہا تھا۔ اور ننھو کے عزائم ہر لمحہ پختگی کی انتہا کو پہنچ رہے تھے —— اس کی بھوک زندہ تھی اور روٹی حاصل کرنے کا خیال جوان!

ننھو کے اندر چھپ کر بیٹھا ہوا انسان گونگا ہو گیا تھا۔ یا شاید وہ بھی بھوکا ہو۔

دوسرے دن ——

Scanned with CamScanner

رات کے گیارہ بج چکے تھے ۔ میم صاحب کی مسکراہٹ میں دعوت اپنے شباب پر تھی۔ شراب کی کئی بوتلیں کھل کر اڑ چکی تھیں ۔۔۔ دونوں مہمانوں میں سے موٹا مہمان پی کر بالکل ہی بے آپے تھا ۔۔۔ وہ میم صاحب سے جانے کیا فضول بکواس کر رہا تھا۔ اور صاحب کے ماتھے پر ایک تیوری ابھر رہی تھی۔ دوسرے دبلے پتلے نوجوان مہمان نے گلاس سے آخری گھونٹ پی کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کی ایک گڈی صاحب کے سامنے رکھ دی ۔۔۔ نتھو نے صاحب کے ساتھ کنکھیوں سے گنا۔ دس دس روپے کے بارہ نوٹ ۔۔۔ اور نتھو کا جی للچا کر رہ گیا۔ موٹے مہمان نے بھی جھوم کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کی ایک گڈی صاحب کے سامنے پھینک دی۔ نتھو نے پھر گنا۔ دس دس روپے کے بیس نوٹ! نتھو کا سینہ مارے لالچ کے پھٹنے لگا۔ صاحب نے موٹے مہمان کے نوٹ اپنی جیب میں ٹھونس لئے۔ اب ان کے ماتھے کی تیوری اتر چکی تھی میم صاحب مسکراتی ہوئی موٹے مہمان کے ساتھ کھڑی ہو گئیں ۔۔۔ دوسرے مہمان کے نوٹوں کی گڈی بے قدری سے میز ہی پر پڑی رہی ۔۔۔

"اور کباب لا ۔۔۔" صاحب نے اپنے گلاس کی بچی ہوئی شراب حلق میں انڈیلنے کے بعد جھوم کر کہا۔ اور نتھو چونک کر باہر نکل گیا۔

نتھو جب کباب لے کر لوٹا تو دیکھا کہ دوسرا مہمان بکتا جھکتا کمرے سے نکل رہا ہے۔ نتھو نے جلدی سے کباب صاحب کے سامنے رکھے اور پھر تنہا بیٹھے ہوئے صاحب کو گالیاں بکتا چھوڑ کر دوسرے مہمان کے پیچھے سٹک گیا ۔۔۔ بالکل اندھا ہو کر اسے روکتے ہوئے نوجوان مہمان کے بچے ہوئے ایک سو بیس روپے وصول کرنا تھے۔ وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے گرتے گرتے بچا۔ گملوں سے ٹکرایا لیکن پھر بھی اندھا دھند دوڑتا رہا اور آخر اس نے جھومتے جھامتے مہمان کو اس کی موٹر کے پاس جا پکڑا۔

"صاحب! صاحب! ذرا رکیئے۔ نتھو جیسے اس سے بھیک مانگ رہا تھا۔

"او۔ نئیں، ام نئیں جائیں گے ۔۔۔ تم کو اش لنگڑے نے بھیجا ہے، ام نئیں جائیں گے ۔۔۔ ام اس موٹے کو مار ڈالیں گے ۔۔۔" وہ بہت جلے ہوئے تھے۔

"صاحب! وہ موٹی عورت تو بہت بری ہے۔ آپ میرے ساتھ آیئے۔ میں لے چلوں حضور کو۔ عورت نہیں، پری ہے پری۔ ابھی بالکل کمسن ہے صاحب ۔۔۔" نتھو نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ اور صاحب جھومتے جھامتے اس کے ساتھ ہو لئے ۔۔۔

نتھو نے آگے بڑھ کر کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ اور صاحب ڈگمگاتے ہوئے کوٹھری میں چلے گئے ۔۔۔

بند دروازے کے قریب نتھو چپ چاپ کھڑا تھا۔ اسکی آنکھوں کے سامنے ایک سو بیس روپے کے نوٹ کھڑکھڑا رہے تھے ۔۔۔ اور اس کے دماغ کے پردوں پر کوٹھی کی بنیاد رکھی جا چکی تھی ۔۔۔ لیکن جانے کیوں اس کی نس نس میں ایک سستا سا خوف سرایت کر گیا تھا۔ ایسا خوف جیسا کہ بے خبری میں قریب سے چوہیا نکل جانے پر محسوس ہو ۔۔۔

صاحب کو موٹر میں بٹھا کر وہ واپس آیا تو دیکھا کہ اس کی عورت چارپائی پر اوندھی پڑی سسکیاں لے رہی ہے ۔۔۔ وہ جھجکتا ہوا اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اور پھولی پھولی سانسوں کے درمیان کہنے لگا

"روتی کاہے کو ہے ری، پگلی نہیں تو ۔۔۔ ساڑیاں لے دوں گا چمکتی ہوئی اور رہنے کو محل بنوا دوں گا تیرے لئے ۔۔۔ اس میں ہرج بھی کیا ہے؟ میم صاحب کو دیکھ ۔۔۔ عزت وزت کوئی چیز نہیں۔ جب تو نے یہ نہیں کیا تھا تو بھی میری تیری کونسی عزت تھی۔ کون مجھے یا تجھے سر پہ بٹھاتا تھا۔ سوائے گالی سے بات کرنے کے، کون ہمارے صبر شکر کی داد دیتا تھا، سوائی ہنسی اڑانے کے؟ اور سچ پوچھ تو روپیہ ہی عزت ہے، طاقت ہے۔ لا روپے دے مجھے، لا ۔"

نھنو جلدی جلدی تھوک نگل رہا تھا۔

عورت کے ڈھیلے ڈھالے جسم میں جیسے ایک دم بجلی بھر گئی۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ "ابے" وہ آنکھیں نکال کر بڑی حقارت سے چلائی — "بڑا آیا ہے محل بنوانے والا۔ جانے کس کو پکڑ لایا تھا حرامجادہ اسے یہ دولت دے گیا ہے وہ تیرا باپ —"

اس نے تکیے کے نیچے سے ایک روپیہ نکال کر زمین پر پھینک دیا۔ نھنو کی آنکھوں کے سامنے وہ ایک روپیہ چمکا اور پھر جیسے بجھ گیا — کوٹھی کی بنیاد برابر ہو گئی۔ اور جیسے اسے اپنے سارے جسم میں پھوڑے اٹھتے معلوم ہونے لگے۔ ایسے پھوڑے جن کی گرمی اور ٹیکن ناقابل برداشت ہو — ایک روپیہ صرف ایک روپیہ۔ اس کی بالی عمریا اور پتلی کمریا والی عورت کی قیمت — اور سینکڑوں روپے اس موٹی میم صاحب کی قیمت! نھنو کا سر جھکتا ہی چلا گیا — اس کی عورت بھی تو کتنی ناراض تھی جیسے اس نے یہ سب اپنے ہی لئے تو کیا ہو۔

اس کی عورت سسکیاں لیتے ہوئے کہے گئی۔

"جانے کون تھا حرامجادہ کہ آیا تو بڑے ٹھٹے سے پر جیب سے نکلا ایک روپیہ، موت پڑے اس پر — اس سے تو اچھا جمن، جس نے ال بھی مجھے کباب روٹی کھلائی اور آج بھی۔ اوپر سے پانچ روپے دئے —"

نھنو کا جھکا ہوا سر ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ دماغ میں کوئی چیز بارود کی طرح بھک سے جل گئی۔

"جمن! تو جمن سے روٹی لینے گئی تھی۔ تو نے اس سے روپے لئے" وہ اس طرح گلا پھاڑ پھاڑ کر چلایا جیسے اس کی عورت نے اس کا کلیجہ نوچ لیا ہو — "تو بدمعاش کہیں کی۔ کیوں گئی تھی اس کے پاس بول، تیرے باوا نے یہی سکھایا ہے تجھے؟ بول —"

ذرا ہی دیر میں دوسری کوٹھریوں سے لوگ نکل کر اس کے دروازے پر جمع ہو گئے۔ نھنو اپنی عورت کو مار رہا تھا — اور وہ تھی کہ چیخ چیخ کر کوٹھری سر پر اٹھائے ہوئے تھی۔

دیوار گر جاتی ہے —
لیکن دھول دیر تک اُڑتی رہتی ہے —

گرتی دیواریں

ایک ایسے سماج کا زندہ مرقع ہے۔ جس کے گرد و غبار کی تاریکی نے بڑے بڑے مفکروں کو عاجز کر دیا ہے

لیکن

ایک فنکار کا قلم اسی تاریکی میں ایسے نقوش ابھارتا ہے جن سے چاہے منزل نزدیک نہ آئے مگر منزل کا راستہ ضرور سجھائی دے جائے گا۔

گرتی دیواریں

میں اوپندر ناتھ اشک کی فنکاری نے یہی راستے سجھائے ہیں

اردو کے سب سے بدنام شاعر مخمور جالندھری کا مجموعۂ کلام!

جلوہ گاہ (دوسرا ایڈیشن)

(اضافہ و ترمیم کے ساتھ)

مخمور وہ خوش نصیب شاعر ہے جسے رجعت پسندوں نے اس لئے گالیاں دی ہیں کہ اس نے زندگی کے چہرے پر پڑی ہوئی مکروہ جھریاں گنوائی ہیں وہ تجربے اور تجزیے کی بے پناہ قوتوں کے ساتھ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے چہرے کی جھلیاں نوچنے لگتا ہے — مخمور نے ایک ایسا آئینہ دکھایا ہے جس میں نظارگی اپنے آپ کو ننگا پا کر برہم ہو جاتا ہے — جدید ایڈیشن میں تیس نئی نظموں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مخمور کی یہ نظمیں اردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہیں۔

قیمت دو روپے

مکتبہ اردو لاہور